سات تمار ے

Rahmadin

سنہ ۱۹۴۴ء

طبع دوم

قیمت سے/

فہرست مضامین

نمبر شمار	افسانہ	افسانہ نگار	نمبر صفحہ
۱	پیش لفظ	جناب شاہد احمد صاحب بی اے (آنرز) مدیر ساقی	۴
۲	پلاٹ	ناشر	۶
۳	رام کہانی	جناب ایم۔ اسلم	۸
۴	فطرت کے دو زاویے ..	جناب قیسی رام پوری	۴۱
۵	خوابوں کی بستی اور حقیقت کی دنیا	جناب شاہد احمد صاحب بی اے (آنرز) دہلوی	۸۶
۶	خواب اور اس کی تعبیر ..	جناب انصار ناصری بی اے ایل ایل بی دہلوی	۱۴۴
۷	حجاب زندگی	جناب فضل حق قریشی دہلوی	۱۸۱
۸	تسخیر حیات	جناب اشرف صبوحی دہلوی	۲۲۷
۹	جھکڑ	جناب سید ابو طاہر داؤد بی ایس سی (علیگ)	[illegible]

پیش لفظ

یک قصہ بیش نیست غم عشق وایں عجب ؛ از ہر کسے کہ می شنوی نا مکرر است

سات افسانہ نگاروں نے ایک ہی پلاٹ پر افسانے لکھے ہیں۔ آپ اس اعلان کو پڑھ کر شاید چونکیں گے اور بعض حضرات اسے مذاق سمجھیں گے اس لئے یہ امر وضاحت چاہتا ہے یہ پلاٹ جناب فضل حق قریشی نے تجویز کیا ہے اور کئی لحاظ سے لائق ستائش ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بےحد لوچ اور لچک ہے۔ ہر افسانہ نگار اس پلاٹ پر اپنے نظریہ کے مطابق ایک عمدہ افسانہ لکھ سکتا ہے۔ ذرا واقعات پر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔
ایک مرد اور ایک عورت میں سلسلہ مراسلت قائم ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں۔ خطوط سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک عورت سے اس مرد کا واسطہ پڑتا ہے اور اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ شادی کر لیتا ہے سابقہ خط و کتابت ختم ہو جاتی ہے اور اپنی تاہل کی زندگی میں مسرور رہتا ہے پھر کچھ ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے اور ناخوش ہو جاتا ہے پہلی خط و کتابت کا سلسلہ پھر قائم کرتا ہے یہاں تک کہ ایک اتفاقیہ واقعہ سے یہ بھید کھلتا ہے کہ میاں بیوی ہی ایک دوسرے کو خط لکھ رہے ہیں۔ فنی دشواریاں بیک نظر افسانہ نگار کو نظر آجاتی ہیں۔ مگر فن کاروں کے لئے موانع ہی بن جاتے ہیں کسی چیز کی

مشکلات ہی اسے ممکن العمل ٹھہراتی ہیں رباعی کے چار مصرعوں میں ایک پوری
بات کہی، آپ کو مشکل نظر آتی ہے مگر آپ رباعی چار مصرعوں سے زیادہ کی
نہیں کہہ سکتے۔ اس پلاٹ میں دو آدمی ایسے دکھائے گئے ہیں جو ایک دوسرے
کو خطوط لکھتے رہتے ہیں اور جب یہ دونوں یکجا ہوتے ہیں تو انھیں علم نہیں ہوتا
کہ ان میں پہلے خط و کتابت ہو چکی ہے۔ کامیاب افسانہ نگار اس ناممکن
سی بات کو ممکن کر دکھائے گا۔ ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی ثابت کر دے گا اور
اس خوبی کے ساتھ کہ پڑھنے والا انھیں حقائق تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے
دولہا دلہن کی زندگی کا مذکور نہیں یہ تو ایک چھوٹا سا رنگین خواب ہوتا ہے
میاں بیوی کی زندگی میں اکثر شکر رنجیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کھانے پینے میں
سودے سلف میں کہیں آنے جانے میں، غرض سیکڑوں باتیں آئے دن
ایسی ہوتی رہتی ہیں کہ ناگوار خاطر گذریں اور انہی کے بڑھنے سے کشیدگی کی نوبت
آجاتی ہے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب انسان خوشگوار ماضی کو یاد کر کے عہد
رفتہ کو آواز دیتا ہے۔ پلاٹ کی خوبی یہاں نظر آتی ہے۔ پرانے خط نکل پڑتے
ہیں۔ رومان کی سنہری دنیا میں تخیل پھر پہونچ جاتا ہے۔ خواب پھر جگائے جاتے
ہیں۔ ایک طرف حقیقت کی دنیا ہے اور دوسری طرف خوابوں کی بستی۔ کیا
یہ خواب حقیقت کو زائل کر دیں گے؟

جب انکشاف حقیقت ہوتا ہے تو کیا گذری ہوئی بہاریں پھر لوٹ آتی
ہیں؟ یا خزاں رسیدہ چمنستانِ حیات اور بھی اجاڑ ہو جاتا ہے؟ کیا حقیقت خواب
کو برباد کر دے گی؟ اور اس بربادی کے نتائج کیا ہوں گے؟ ان سوالات کا جواب
ہر افسانہ نگار نے دیا ہے۔

اس مجموعہ میں بعض افسانے مزاحیہ رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ بعض میں

سنجیدہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ بعض میں شاعرانہ ادب نظر آئیگا اور بعض میں آپ زبان کا چٹخارہ پائیں گے۔ پلاٹ ایک ہی ہے مگر ہر افسانہ آپ کو نیا نظر آئے گا۔ یا یوں سمجھیے کہ روح ایک ہی ہے جو مختلف قالبوں میں ڈھل گئی ہے۔ ہر عمارت میں ایک ہی سا مسالہ ہے۔ وہی چونا، اینٹ، پتھر، لکڑی وغیرہ مگر معمار کی کاریگری و ہنروری سے عمارت کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ ہر افسانہ نگار نے چابک دست معمار کی طرح ایک ہی پلاٹ کی بنیاد پہ افسانہ کی عمارت نئی وضع قطع اور نرالے ڈھنگ سے تعمیر کی ہے ؎

یگانگت کا یہ عالم کہ اصل سب کی ایک
تضاد یہ کہ جدا شان ہر فسانے کی

شاہد احمد

پلاٹ

ایک شخص ——— غیر متعارف خاتون سے خط وکتابت ———

رومانی فضا اور دلبستگی ——— ایک حسینہ سے تعارف ——— محبت ———

ازدواج ——— مسرت و انبساط ——— شکر رنجیاں ——— کشیدگی ———

بیزاری ——— ایام گذشتہ کی یاد ——— سابقہ مراسلت کی تجدید ———

تحصیل سکون ——— اتفاقیہ طور پر انکشاف حقیقت ———

مراسلہ نگار خاتون کی اصل شخصیت ؟ شریک حیات ——— !! ———

رام کہانی

سبزے کے فرشِ زمردی پر جہانیاں جہاں گشت بہرام چائے کی پیالی سامنے رکھے کہنی کے نیچے چمڑے کا ایک بیگ دبائے خاموش بیٹھا تھا ایک طرف نرگس اور طاؤس بیٹھے مزے مزے سے چائے پی رہے تھے۔ اور گاہے گاہے ایک دوسرے کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ بھی لیتے۔

بہار کا موسم تھا اور شگوفے جوبن پر تھے۔ انار کے پھولوں کی لالی پر خونِ شہیداں کا دھوکا ہوتا تھا۔ شاخِ سنبل پہ قمریاں بیٹھی اپنی کوکو سے فضا میں ایک اداسی کا عالم پیدا کر رہی تھیں۔ جنوب مغرب کی جانب خورشیدِ خاوری کی چمک ناسپاتی کے پیڑوں میں سے کچھ اس طرح چھن چھن کر آ رہی تھی جیسے کسی نے مقیش اور بادلہ کی جھالر شاخوں اور پتوں میں ڈال رکھی ہو۔ مشرق کی جانب آم کے درختوں کے نیچے رہٹ چل رہا تھا۔ جس کی آواز کا پُرکیف زیر و بم اور پُرسوز ترنم ملاگشتانِ محبت

کو کسی اور ہی عالم میں لئے جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی کسی پیڑ پر سے پچھلے پہر کی کوئل کی کوک سے خواہ مخواہ آنکھیں بھر آتی تھیں۔

بوڑھے بہرام نے ایک لمبا سانس لیا اور پیالی منہ سے اٹھا کر لگائی۔ نرگس جس کا حسن و جمال موسم بہار کے پھولوں کو شرماتا تھا۔ ہنس کر بولی۔ "کس خیال میں ہیں بہرام جی آپ؟"

بہرام نے پیالی گھاس پر رکھ دی اور بولا۔ "یہ بہار کا موسم بھی کیا مزے کا موسم ہے۔" طاؤس کی طرف دیکھ کر "کیوں طاؤس تمہارا کیا خیال ہے؟"

طاؤس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بہرام جی! موسم میں کیا رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت کی محبت خزاں کو بھی بہار بنا دیتی ہے۔"

"سچ کہتے ہو۔" بوڑھا بہرام بولا۔ "جس کی رفیق حیات نرگس ہو وہ خزاں کے مظالم کیا جانے۔"

"تب ہی تو کہتی ہوں!" نرگس بولی "آپ شادی کرلیں۔"

"شادی کر لوں۔" بہرام نے سر ہلا کر کہا۔ "میں موت کی راہ دیکھتا ہوں اور نرگس تم مجھے شادی کرنے کو کہتی ہو۔ شادی کرکے بھی دیکھ چکا اور جو سچ پوچھو تو مجھے تو افسوس ہے کہ میں نے شادی کی ہی کیوں۔ نہ شادی ہوتی نہ یہ چرکے لگتے۔ نرگس! جینا اسی کا نام ہے جسے آخری وقت میں اپنی رفیق حیات کا سہارا ہو دور کیوں جاؤ۔ مجھے ہی دیکھ لو نا۔ نہ گھر نہ گھاٹ آج یہاں پڑا ہوں کل کہیں اور جا ڈیرا لگاؤں گا۔ موت تو ...."

"بس میں نہیں سنتی!" نرگس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے خشک زاہدوں کی سی باتیں قطعی پسند نہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے!" طاؤس نے کہا۔ "وقت کی راگنی ہی بھلی لگتی ہے"
اور بوڑھا بہرام ایک آہ بھر کر بولا "سچ ہے بہار کے موسم میں خزاں کا کیا ذکر"



کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر نرگس بولی "بہرام جی! عرصہ ہوا کہ آپ نے ایک واقعہ سنایا تھا۔ وہی "در تو یہ" والا قصہ، یاد ہے نا۔ اب دیکھئے مسکرایئے نہیں۔ قسم لے لیجئے، جب کبھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو طبیعت پر ایک چرکا سا لگتا ہے خیر! وہ تو جگ بیتی تھی آج حسب وعدہ آپ بیتی سنا دیجئے اس بیگ میں جو خطوط آپ ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں یا تو یہ میرے حوالے کیجئے، یا یہ تبلایئے کہ یہ کس کے خط ہیں۔"

"نرگس!" بہرام بولا۔ "کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔"

"چلو میں بچہ ہی سہی"۔ نرگس نے کہا۔ "لیکن سن لیجئے، بچے بہت ضدی ہوتے ہیں، تو آج جب تک آپ سے سن نہ لوں گی نہ خود یہاں سے اٹھوں گی اور نہ آپ کو جانے دوں گی۔ سن لیا نا آپ نے؟"

"لیجئے حضرت!" طاؤس نے ہنس کر کہا۔ "بس اعلان جنگ ہو گیا۔

"نرگس تو پاگل ہے"۔ بہرام نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں! نرگس بولی۔ "جو ہٹ کا پکا ہو وہ پاگل ہی تو ہوتا ہے"۔

"تو گویا" طاؤس نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تو آج تم یہ معلوم کر کے ہی سانس لوگی کہ بہرام جی نے بیگ میں کس کے خط رکھ چھوڑے ہیں اور وہ جو سینما چلنے کا ارادہ تھا؟"

"بھاڑ میں جائے سینما"۔ نرگس نے تڑخ کر جواب دیا۔ پھر بہرام کی طرف دیکھ کر "ہاں بہرام جی پھر کیا ہوا؟"

" نرگس تم میری سرگذشت سن کر کیا کرو گی۔ کہو تو کوئی اور کہانی سنا دوں"۔
" جی نہیں"! نرگس نے بہرام کی پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے
جواب دیا۔
پھر طاؤس بولا۔" دیکھیں آج کس کی جیت ہوتی ہے۔ نرگس بھی ہٹ
کی پکی ہے اور بہرام جی بھی ضد کے پورے ہیں"۔
" تم بھی تو ضد کے بڑے پکے بنا کرتے ہو"! نرگس نے خاوند کی طرف
دیکھ کر ایک دلآویز انداز سے پوچھا" پھر جیت کس کی ہوئی ہے؟"
پھر بہرام کی طرف دیکھ کر" جی! پھر کیا ہوا؟"
بہرام جو قمریوں کی کوکو پر کان لگائے بیٹھا تھا مسکرایا اور نرگس کی طرف
دیکھ کر بولا" نرگس! تم اپنے مضراب شوق کے تاروں سے میری زندگی کے
رباب کے ان تاروں کو چھیڑ رہی ہو جن کے نغموں سے تمہارے امنگ بھرے
دل کو ٹھیس سی لگے گی۔ لو میں تمھیں اپنی شادی کا قصہ سناتا ہوں"۔

" نرگس! میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اور جوان تھا اور بیشتر وقت
مختلف رسائل کے لئے مضامین لکھنے میں گذرتا۔ میں فرضی نام سے اپنے
افسانے شائع کروایا کرتا۔ ایک مدت سے میں دیکھ رہا تھا کہ اب صنف لطیف
بھی مضمون نگاری کے میدان میں اتر رہی ہے۔ لیکن اللہ جانے اکثر لڑکیوں
کی تحریر سے مجھے آنے لگتی ہے دو ایک چوٹی کے رسالوں میں" شمشاد" کے
نام سے بھی گاہے گاہے کوئی افسانہ شائع ہوا کرتا تھا اور سچ جانئے کہ
شمشاد کے افسانے پڑھ کر بہت لطف آتا تھا شمشاد کے افسانے کی فضا میں ایک
روحانیت ہوتی تھی۔ وہ جذبات کا ایک ایسا مدوجزر پیدا کر دیتی کہ پڑھنے

والوں کا دل یا کم از کم میرا دل اس کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگتا جو منلاطسم سطح آب پر جاری ہو۔ عشق و محبت کی چاشنی تو شمشاد کے سبھی افسانوں میں ہوا کرتی۔ لیکن تحریر ایسی سلجھی ہوئی ہوتی کہ پامال سے پامال مضمون میں بھی لطافت پیدا ہو جاتی اور چونکہ وہ ایک عورت تھی اس لئے قدرتی طور پر اس کے مضامین میں نسوانی جذبات۔ نسوانی امنگیں اور عورت کے فطرت کے مطابق پلاٹ میں نسوانی کمزوریاں بھی بکثرت موجود ہوتیں۔

لیکن میرے لئے افسانے کے علاوہ جو چیز شاید زیادہ جاذب توجہ تھی وہ اس لکھنے والی کا نام تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا وجہ تھی جو اکثر بیٹھے بیٹھے میں یہی پانچ حروف "ش، م، ش، ا اور د" مختلف طریق سے زبان سے ادا کرتا۔ کبھی ش اور م پر زور دیتا۔ کبھی ش اور الف کو لمبا کر کے زبان پر لاتا بہر کیف جس وقت "شمشاد" زبان پر آتا تو ساتھ ہی اس نام کی لطافت یا میرے زبان سے ادا کرنے کا ترنم بھی دل میں ایک چٹکی سے لیتا۔

کئی بار ارادہ کیا کہ ایڈیٹر سے شمشاد کا پتہ معلوم کروں لیکن ہمت نہ پڑی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جذب الفت قائم ہو تو اس کی تاثیر سب عقدے وا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک روز میں مختلف رسائل جو ڈاکیہ ابھی ابھی لایا تھا، دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک نسوانی رسالہ کی فہرست مضامین میں میری نگاہ پھر اسی "پیارے" نام شمشاد پر پڑی اور قسمت نے یاوری یوں کی کہ رسالے کے مدیر یا مدیرہ نے شمشاد کے مضمون کے شروع میں تعارفی طور پر جو چند سطور لکھی تھیں ان میں اس شہر کا نام بھی لکھ دیا تھا جہاں اسکی بود و باش تھی۔

میں اسی وقت اسے خط لکھنے بیٹھ گیا۔ سب سے بڑی مشکل یہ آ پڑی کہ

القاب کیا لکھوں، مس شمشاد" مجھے کچھ پسند نہ تھا "محترمہ" کچھ ثقیل سا لفظ تھا "شمشاد" اس طرح مخاطب کرنے کا بھلا مجھے حق کہاں "شمشاد صاحبہ" اس میں کچھ کاروباری بو آتی تھی نہ ڈیر شمشاد" توبہ ہے! کیا ابھی سے۔ الغرض کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خیر ارادہ کیا کہ پہلے خط تو لکھوں، القاب بعد میں دیکھے جائیں گے گو میرا اردو کا خط کچھ ایسا اچھا تو نہ تھا۔ تاہم میں دو تین مختلف طریق سے خط لکھ سکتا تھا اور چونکہ اپنے مضامین بہرام کے فرضی نام سے شائع کراتا تھا اس لئے یہ احتیاط بھی ضرور کرتا کہ کوئی آشنا سا میرا خط بھی نہ پہچان سکے

لیکن آپ مشہور تو اسی نام سے ہوئے" طاؤس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

نرگس نے خاوند کی طرف تیوری چڑھا کر دیکھا اور کہا "مجھے یہ دخل در معقولات پسند نہیں۔ بس اب بیچ میں نہ بولنا تم"

"توبہ ہے!" طاؤس نے ہنس کر کہا "ع۔ یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تری محفل میں"

"ہاں بہرام جی!" نرگس نے بوڑھے بہرام کی طرف جو ذرا مسکرا کر ان دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا کہا "پھر آپ نے کیا لکھا؟"

بوڑھے بہرام نے چمڑے کے بیگ میں سے ایک خط دیکھ بھال کر نکالا اور کہا "لو سن لو یہ پہلا خط ہے"

"میں اکثر رسائل میں آپ کے مضامین دیکھتا رہتا ہوں اور بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا طرز تحریر بہت دلپذیر ہے۔ آپ کے اکثر افسانوں کے پلاٹ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے ان میں مغربیت کی جو ایک جھلک سی نظر آتی ہے پسند نہیں

تعلیم نسواں کے متعلق جو مضمون آپ نے لکھا ہے، یقین جانئے اسے دیکھ کر تو میں حیران ہی رہ گیا۔ میں آپ کی جرأت کی داد دیتا ہوں۔ واقعی اس قسم کے خیالات کے اظہار کے لئے ہمت اور حوصلہ درکار ہے۔

گو مجھے آپ کے محلے یا کوچے کا نام معلوم نہیں۔ لیکن محض اس خیال سے کہ آپ کا نام ہی کافی ہے۔ یہ خط آپ کا اور آپ کے شہر کا نام لکھ کر ڈال رہا ہوں۔ اگر رسید ملی تو جانوں گا کہ خط منزل مقصود پہ جا پہنچا۔

خیر طلب

بہرام

"لیکن آپ نے القاب کیا لکھے؟" نرگس نے پوچھا۔

طاؤس نے کہا "شمشاد صاحبہ" لکھدیا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا بہرام جی"

نرگس تیوری چڑھا کر بولی "چپ نہیں رہو گے تم؟"

طاؤس نے ہنس کر کہا "جو تم بولو گی تو میں بھی بولوں گا۔ ٹھیک ہے نا بہرام جی؟"

"بھئی!" بوڑھے بہرام نے کہا "تم آپس ہی میں نپٹ لو"

نرگس نے گرم گرم چائے ایک پیالی میں ڈالی اور خاوند کی طرف دیکھ کر کہا "لو اب بولنا تم۔ جو یہ گرم گرم چائے نہ ڈال دی ہو تم پر"

طاؤس نے بناوٹ سے ایک آہ بھر کر کہا "تو بہ ہے۔ ع یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری"

نرگس نے طاؤس کی کلائی میں زور سے چٹکی لی اور کہا "باز نہیں

آؤ گے تم ؟ "

"ارے چھوڑ دو" طاؤس نے کہا " اب نہ بولوں گا "

بڈھا بہرام زیر لب مسکرا رہا تھا۔

" اب آپ بھی بولیں گے یا نہیں ؟ " نرگس نے پوچھا۔

" نرگس !" بہرام کہنے لگا " القاب کے انتخاب میں واقعی بڑی دقت پڑی۔ بہر کیف مس شمشاد سے بہتر اور کوئی القاب نہ سوجھا۔ اب میں جواب کا انتظار کرنے لگا۔ سارا سارا دن ڈاکیہ کی راہ دیکھتا۔ آخر خدا خدا کر کے جواب آیا "

اتنا کہہ کر بہرام نے پھر اس بیگ میں سے ایک خط نکالا اور کہا " لو سنو یہ جواب ہے "

" مسٹر بہرام !

آپ کے گرامی نامہ کا شکریہ !

میں تو اس سرزمین میں بالکل نووارد ہوں ہاں اگر آپ جیسے ادیب نے سیدھی راہ پر ڈال دیا تو شاید کبھی منزل تک جا ہی پہنچوں۔

میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ ملک کا مشہور انشا پرداز میرے مضامین پسند کرتا ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ میں تو آپ کی ہی خوشہ چیں ہوں۔ بہر کیف آپ کے حوصلہ افزا الفاظ کے لئے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

طالب توجہ

شمشاد "

سن لیا نرگس! بہرام نے خط بیگ میں رکھتے ہوئے کہا " یہ تھا میرے خط کا جواب میں نے اس خط کو کئی بار پڑھا۔ شوق سے کہہ لو یا محض اس لئے کہ مزید خط لکھنے کی مجھے اس میں کوئی راہ نظر آئے۔ ایک اشارہ تو ضرور تھا خیر ایکئی۔ روز گذر گئے۔ نہ میں نے خط لکھا نہ ادھر سے کوئی خط آیا۔ اسی اثنا میں میرا ایک افسانہ ایک مشہور رسالے میں شائع ہوا۔ اس کے شائع ہونے کے پانچ سات روز بعد مجھے " شمشاد " کا دوسرا خط ملا۔ القاب وہی مسٹر بہرام تھا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد افسانے کے متعلق جو لکھا تھا وہ تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔

بہرام نے تھیلے میں سے ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگا۔

...... معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عورت کی فطرت کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ لیکن میں ایک بات نہیں سمجھ سکی۔ عورت خواہ عصمت فروش ہی کیوں نہ ہو۔ آخر اس کے پہلو میں بھی تو ایک تڑپنے تڑپانے والا دل ہوتا ہے۔ لیکن آپ کے افسانے سے تو میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ ایک پیشہ ور عورت اس جوہر سے محروم ہوتی ہے۔ دل تو اس کے پاس بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہی بقول آپ کے " پتھر کا ٹکڑا "۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو کسی مرد سے تھوڑی سی بھی محبت ہو پھر اس کا دل یوں کیسے کورا ہو سکتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ درِ جنت کی کلید محبت ہے۔ اس سے پہلے آپ لکھ چکے کہ محبت کو زوال نہیں۔ تو پھر میں حیران ہوں کہ عورت " عصمت فروش " ہی سہی۔ لیکن وہ ایک مرد سے جس کو

اس کا چند روزہ تعلق رہ چکا ہو اتنی بے مروتی کیسے کر سکتی ہے
کیسے آنکھیں پھیر سکتی ہے۔ ہاں! جب آپ کا یہ مطلب ہو کہ
جب عورت عصمت فروشی کا پیشہ اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ
"عورت" ہی نہیں رہتی۔ بہرکیف آپ کا یہ افسانہ اس قدر
پرلطف ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی میری طبیعت ابھی تک
سیر نہیں ہوئی۔"

بہرام نے خط پھر بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "شمشاد نے جو بحث
چھیڑ دی تھی۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک اور صورت اختیار کر لی
اب دونوں جانب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا" شمشاد کے
خط زیادہ طویل ہوتے ہیں وہ ایسی باتیں بھی لکھ دیتی جن کے لکھنے کا مجھے
حوصلہ نہ پڑتا۔ بعض باتوں میں اس کا استدلال اتنا قوی ہوتا کہ مجھ سے
کچھ جواب نہ بن پڑتا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا خط و کتابت میں کچھ بے تکلفی
کا عنصر بھی موجود ہو گیا اور وہ رسمی حجاب جو ابھی تک قائم تھا بالکل مفقود ہو
گیا۔ اس کے ایک خط کے جواب میں میں نے لکھا:۔"

بہرام نے بیگ میں سے ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگا:۔

شمشاد!

شباب کی مثال تو گرمیوں کے اس دن کی طرح ہے جب
آسمان پر ہلکا ہلکا ابر چھایا ہو اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو۔ جب
بادل پھٹے اور سورج نکلا تو وہ کیف بھی جاتا رہا۔
محبت کی مملکت میں "امتیاز" نہیں ہوتا۔ نہ "رنگ و بو" کا نہ "ما و تو"
کا۔ محبت کی غذا بھی محبت ہے اور یہ آنکھیں ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تم جس

قدر محبت کو چھپاؤ وہ اسی قدر عریاں اور نمایاں ہوگی۔ محبت کی
ترجمان بھی آنکھیں ہی ہوا کرتی ہیں۔ لیکن محبت آنکھ سے نہیں
دیکھتی بلکہ دل سے۔ یعنی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ زندگی
کی مثال تو ایک جام کی سی ہے اور محبت اس میں بادۂ ناب
کی طرح مستور۔ محبت کا خواب اس قدر شیریں اور سہانا ہوتا ہے
کہ اس کی یاد بھلائے سے نہیں بھولتی۔ اس کا نقش اگر دل پر ہو
جائے تو پھر مٹائے نہیں مٹتا ......"

طاؤس نے نرگس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا " نرگس یہ ہے فلسفہ محبت
اب بھولنا مت "

پھر بہرام کی طرف دیکھ کر۔" بہرام جی! یہ تو آج ہی معلوم ہوا کہ آپ کا دل
بھی چوٹ کھایا ہوا ہے "

اور نرگس جھلا کر بولی " اے خدا کے لئے چپ بھی رہو تم " پھر بہرام سے
" اور شمشاد نے اس کا جواب کیا دیا ؟ "

" لو وہ بھی سنو " بوڑھے بہرام نے یہ کہہ کر بیگ میں سے تلاش
کرکے ایک اور خط نکالا :۔

مسٹر بہرام !

فلسفہ محبت جس طرح آپ نے بیان کیا، میں اس
سے بالکل ناآشنا تھی۔ میں اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے
تیار نہ تھی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے لیکن اب اس حقیقت
سے آگاہ ہو چکی ہوں۔
آپ نے شباب کی مثال جس لطیف پیرایہ میں دی ہے

یقین جانیے میری طبیعت پر اس کا بہت اثر ہوا۔ آپ کے خط کا وہ حصہ جس میں آپ نے فلسفہ محبت بیان فرمایا ہے میں نے کئی بار پڑھا اور بہت غور کیا۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے اسی طرح یاد کر لوں جس طرح کبھی سبق یاد کرتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ جس کی طبیعت دوسروں سے زیادہ حساس ہو وہ محبت کے جذبات سے اوروں کی نسبت زیادہ آشنا ہوتا ہے اور شاید زندگی کا لطف بھی کچھ اسے ہی حاصل ہو جو اس رمز سے آشنا ہو ...... "

بہرام تو خط بیگ میں ڈال رہا تھا۔ لیکن طاؤس اور نرگس دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ہاں قمریوں کی کوکو اور رہٹ کی پر سوز آواز کچھ زندگی کا احساس پیدا کر رہی تھی اور موٹے موٹے آنسو بوڑھے بہرام کی آنکھوں سے ڈھلک کر اس کی برف سی سفید ریش پر گر کر چمک رہے تھے وہ ایک دو بار پھر کھانسا اور گلا صاف کر کے کہنے لگا :۔

" نرگس! جاڑے جا چکے تھے اور بارش نہ ہونے کے باعث موسم کافی گرم ہو چلا تھا۔ جب کالج میں تھا تو چھٹیوں کے دن کسی پہاڑ پر جا کر گذارتا۔ اب چونکہ فارغ تھا۔ اس لئے اپریل کے آخری ایام میں پہاڑ پر چلا گیا۔ جانے سے چند روز پہلے میں نے " شمشاد " کو بھی اپنے ارادے کی اطلاع کر دی۔ لیکن میرے خط کا جواب کسی قدر مایوس کن تھا۔ کیونکہ اس نے لکھا تھا کہ وہ بھی عنقریب کسی پہاڑ پر جانے والی ہے اور چونکہ کنبے کے اکثر لوگ ہمراہ ہوں گے اس لئے خط و کتابت کا یہ سلسلہ مہینہ دو مہینے کے لئے مجبوراً بند رہے گا۔ کچھ احباب اس قسم کی باتوں کے سخت خلاف ہیں۔

خیر! مجھے پہاڑ پر آئے بہت روز ہو چکے تھے ۔ یہاں سوائے سیر
کے اور کام ہی کیا تھا ۔ ایک پہاڑی کے گرداگرد کوئی تین میل لمبی سڑک تھی ۔
اکثر لوگ اسی پر سیر کیا کرتے ۔ دو چار آدمیوں سے میری شناسائی بھی ہو گئی
وقت مزے سے گذرتا تھا اس سڑک پر سب سے زیادہ جاذب نظر جو چیز
نظر آتی وہ کوئلے بیچنے والی لڑکیاں تھیں ۔ قدرت نے کیا حسن و جمال انھیں
عطا کیا تھا ۔

ایک روز میں سیر کرتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں چیسٹنٹ کے درخت
تھے اور لب سڑک لکڑی کی ایک بنچ سی رکھی تھی ۔ ذرا ستانے کو بیٹھ گیا میں
آج اپنے بنگلے سے دیر سے نکلا تھا ۔ مجھے بیٹھے دس پندرہ منٹ ہوئے
ہوں گے کہ ایک بوڑھا آدمی اور ایک جوان لڑکی سیر کرتے ہوئے ادھر آنکلے
ان کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا ۔ نو وارد معلوم ہوتے تھے ۔ یہ بوڑھا بھی اسی
بنچ پر بیٹھ گیا اور لڑکی چیسٹنٹ کے درختوں کے نیچے جا کھڑی ہوئی ۔

بوڑھا تو خاموش بیٹھا مناظر قدرت کا لطف اٹھا رہا تھا ۔ لیکن لڑکی پتھر مار کر چیسٹنٹ
گرانے کی کوشش کر رہی تھی کبھی وہ ادھر اور کبھی ادھر ۔ کسی چیسٹنٹوں تک پہنچتا اور کوئی خطا کر جاتا میں گاہے گاہے
اس لڑکی کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتا ۔ کوئی اٹھارہ انیس برس
کے قریب سن و سال تھا ۔ سرو قد اور نرگسی آنکھیں تھیں ۔ سر کے بال اس قدر
لمبے کہ کمر سے نیچے لٹک رہے تھے ۔ فیروزی رنگ کی ساڑی تھی اور چہرہ کندن
کی طرح چمک رہا تھا ۔ وہ چیسٹنٹوں کے درختوں کے گرداگرد اس طرح گھوم رہی
تھی جیسے موسم بہار کی تیتری پھولوں کا طواف کر رہی ہو ۔ بوڑھا بولا " نوشابہ
کیوں مفت میں تھک رہی ہو ! "

" میں دو ایک تو توڑ کر ہی چھوڑوں گی ۔" نوشابہ اپنی دھن میں لگی ہوئی

بولی۔ ساتھ ہی سامنے کی جانب سے جو ایک پتھر اٹھا کر پھینکا تو وہ میرے گھٹنے پر آ لگا۔

"اوہو! معاف فرمایئے۔" بوڑھے نے معذرت کے طور پر کہا۔

"کیا ہوا؟" نوشابہ نے وہیں سے کھڑے کھڑے اپنی میٹھی آواز سے پوچھا۔

"پگلی!" بوڑھے نے کہا "دیکھ تو سہی تو نے ان صاحب کا گھٹنا پھوڑ دیا۔"

یہ سن کر نوشابہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور بولی "چوٹ تو نہیں لگی! معاف کیجئے! بہت نادم ہوں!"

میں نے ہنس کر کہا "فکر مت کیجئے۔ میرا گھٹنا اتنا نازک نہیں کہ ایک سنگریزہ لگنے سے زخمی ہو جائے۔"

"چوٹ تو ضرور آئی ہو گی۔" اس حسینہ نے پھر ایک بار اپنی دلکش آواز سے کہا۔

"آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔" میں نے کہا "آپ کو کوئی چلغوزہ بھی ملی؟"

بوڑھا بولا "یہ تو پگلی ہوئی ہے کبھی چٹنیں یوں ہی توڑا کرتی ہیں۔"

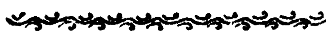
"ٹھہریئے! میں توڑ دیتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں! نہیں!" بوڑھا اور نوشابہ دونوں بولے "آپ تکلیف مت کیجئے۔"

"تکلیف کیسی!" کہتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر سے پتھر اٹھا کر پندرہ بیس بڑی بڑی چٹنیں توڑ دیں۔

"شکریہ!" بوڑھے نے کہا۔

اور نوشابہ بولی" اف توبہ! بھلا اتنی میں کیا کروں گی؟"
"چلو!" بوڑھے نے کہا" اب اٹھاؤ انھیں!"
نوشابہ نے رومال زمین پر بچھایا اور کانٹوں سے ہاتھ بچا بچا کر.... چِلغوزے اس میں ڈال لیں۔
"آپ کہاں مقیم ہیں؟" بوڑھے نے مجھ سے پوچھا۔
میں نے اپنی کوٹھی کا پتہ بتایا۔ اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہم سڑک کے موڑ پر پہنچے۔ یہاں میں ان سے رخصت ہوا۔



پہاڑ پر میرا وقت اکثر مطالعہ میں گذرتا تھا۔ لیکن اس دن مطالعہ میں جی نہ لگا اور لگتا بھی کیسے جب ایک شوخ و تننگ اور طرح دار لڑکی کا تصور آنکھوں کے سامنے رقص کر رہا ہو اور کانوں میں اس کی دلکش آواز کا ترنم "کہیں چوٹ تو نہیں آئی" متواتر گونج رہا ہو۔ نوشابہ! کس قدر پیارا نام تھا اور یہ نوشابہ کیا تھی؟ حسن قدرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر۔ جس کا حسن و جمال اس موتی کی طرح تھا جو صدف کے سینہ سے عریاں ہو کر ساحل پر پڑا چمک رہا ہو۔

میرا معمول تھا کہ پچھلے پہر کی چائے ٹھیک چار بجے پی لیا کرتا اور پانچ بجے کے قریب سیر کے لئے نکل کھڑا ہوتا۔ راستہ میں ملنے جلنے والے مل جاتے۔ لیکن آج چائے پیتے ہی سیر کو چل نکلا اور گھومتے گھامتے ان ہی چلغوزوں کے درختوں کے پاس پہنچ کر بیٹھ گیا۔ لیکن جس مقصد اور تمنا سے یہاں بیٹھا تھا۔ وہ آج پوری نہ ہوئی۔ دوسرے روز جو میں گھر سے سیر کو نکلا تو راستہ ہی میں وہ بوڑھا اور نوشابہ جس کا خیال مجھے رات بھر پریشان

کرتا رہا۔ مل گئے۔ بوڑھے نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ہم آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے"۔

"میرا!" میں نے کہا اور نوشابہ کی طرف دیکھ کر پوچھا "شاید انھیں آج بھی وہی چٹنیاں تڑوانی ہوں گی؟"

یہ سن کر نوشابہ ہنسنے لگی۔ بالکل اسی طرح جیسے موسم بہار میں کوئی کلی خود بخود چٹک جائے۔

بوڑھا بولا "ہمیں افسوس ہے کہ کل آپ ہمارے بنگلے تک تو آئے لیکن ہم آپ کو اندر آنے کی دعوت دینا بھول گئے"۔

میں نے کہا "لیکن میں تو راستے ہی سے الگ ہو گیا تھا۔ آپ کے بنگلے تک کب پہنچا؟"

اب نوشابہ بولی "آپ جہاں سے الگ ہوئے تھے وہیں پاس ہی تو ہمارا بنگلہ تھا۔ میں نے ہنس کر پوچھا "آپ کا ارادہ تو تھا؟"

"ہاں تھا تو ضرور!" نوشابہ نے شباب کی اداؤں سے سر ہلا کر کہا۔

"تو بس شکریہ!" میں نے مسکرا کر کہا "اصل مطلب تو نیت سے ہے"۔

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم پھر انہی چٹنیوں کے پاس جا پہنچے بوڑھا بنچ پر بیٹھ گیا اور نوشابہ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا "تو کیا آج چٹنیاں نہ توڑیے گا؟"

"جیسے کل توڑی تھیں" نوشابہ نے مسکرا کر کہا۔

بوڑھا بولا "کل سارا دن تو اس بچی کا بازو دکھتا رہا"۔

"آپ کہیں تو میں توڑ دوں؟" میں نے نوشابہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں" نوشابہ بولی "آپ تکلیف نہ کریں"۔

میں نے ہنس کر کہا " لیکن آپ کے الفاظ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں ٹہنیاں توڑ دوں اور یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اصل چیز تو نیت ہے "

بوڑھا اور نوشابہ دونوں ہنسنے لگے۔ میں نے کہا " اگر آپ کو میری تکلیف کا خیال ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ کچھ تکلیف آپ بھی فرمائیں "

" میں ! " نوشابہ نے کہا " کیا ؟ "

" آپ پتھر اٹھا اٹھا کر مجھے دیئے جائیں " میں نے جواب دیا۔

بوڑھا بولا " ہاں ! یہ ٹھیک ہے "

چنانچہ نوشابہ اِدھر اُدھر سے پتھر اٹھا اٹھا کر مجھے دینے لگی اور میں ٹہنیاں توڑنے لگا۔ جب پندرہ بیس ٹہنیاں ٹوٹ چکیں تو بوڑھے نے کہا " نوشابہ اب چھوڑ دو بھی۔ تم انھیں بھی مفت میں پریشان کر رہی ہو "

نوشابہ نے رومال بچھا دیا۔ اور ہم دونوں نے اِدھر اُدھر سے ٹہنیاں اٹھا کر اس میں ڈالیں اور پھر تینوں آگے چلے۔ باتوں باتوں میں بوڑھے نے کہا " آپ نے اپنا نام تو ہمیں بتلایا ہی نہیں "

" مجھے سہراب کہتے ہیں " میں نے کہا " اور آپ کا اسم گرامی ؟ "

" یہ لوگ مجھے فریدوں بابا کہہ کر پکارتے ہیں " بوڑھے نے جواب دیا۔

میں نے نوشابہ کیطرف دیکھکر کہا " آپ بھی اپنا نام بتلا دیجئے "

" لو یہ اچھی رہی " اس نے ہنسکر کہا " میرا نام تو آپکو کل ہی معلوم ہو گیا تھا "

کیا ؟ " میں نے کہا " معاف فرمائیے۔ مجھے تو یاد نہیں ہے "

" فریدوں بابا سے پوچھ لیجئے "

" نام آپ کا اور پوچھوں فریدوں بابا سے وہ کیوں ؟ "

فریدوں بابا بولا " ہاں بتلا دو نا اس میں ہرج ہی کیا ہے ؟ "

"کیا تبلا دوں ؟" نوشابہ نے شرارت آمیز نظروں سے فریدوں بابا کی طرف دیکھ کر پوچھا ۔

"اپنا نام ؟" میں نے کہا "مجھ سے ہی غلطی ہوئی جو میں نے تبلا دیا"

نوشابہ ہنسنے لگی ۔

"اچھا کل تبلا دوں گی ۔"

جب بنگلے کے قریب پہنچے تو نوشابہ نے کہا "کل آپ چائے ہمارے ہی ہاں پیجیے گا ۔"

"معاف فرمائیے" میں نے مسکرا کر کہا ۔ "جب مجھے صاحب خانہ کا نام ہی معلوم نہیں تو آ کیسے سکتا ہوں"

"ہاں بھائی" بوڑھا فریدوں ہنس کر بولا "یہ تو آپ نے ٹھیک کہا"

"خیر!" نوشابہ نے میری طرف دیکھ کر کہا "کل آپ تشریف تو لائیں"

"میں عرض تو کر چکا" میں نے کہا کہ "جب تک میزبان کا نام معلوم نہ ہو کیسے آ سکتا ہوں"

"بہت مشکل آ پڑی یہ تو" نوشابہ نے لجا کر کہا ۔ پھر بوڑھے کی طرف دیکھ کر بولی "فریدوں بابا آپ ہی تبلا دیجیے نا !"

"اور تم کیوں نہ تبلاؤ ؟"

"لیجیے اب مجھے اجازت دیجیے ، پھر کسی روز ملاقات ہوگی"

"اور کل نہیں ؟" نوشابہ نے پوچھا ۔ کل آپ چائے پر جو تشریف لا رہے ہیں"

"کہاں ؟"

"نوشابہ نے نیم باز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا" نوشابہ کے بنگلے پر !"

"شکریہ! کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

اگلے روز میں ٹھیک چار بجے نوشابہ کے بنگلے پر جا پہنچا۔ بنگلے کے عقب میں ایک چھوٹا سا سرسبز میدان تھا۔ اسی جگہ چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اِدھر اُدھر قرینے سے تین تپائیاں رکھی تھیں ان پر پھول دار رومال پڑے تھے ہر ایک تپائی پر تین تین پیالیاں رکھی تھیں۔ بوڑھے فریدون نے میرا گھر کے اور لوگوں سے تعارف کرایا۔ یہاں صرف میں ہی تھا۔ نوشابہ نے آج کاسنی رنگ کی ایک کامدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ فریدون نوشابہ اور میں ایک ہی جگہ بیٹھے۔ چائے بہت پُرتکلف تھی۔ نظر کے سامنے ایک عمیق گھاٹی تھی۔ دوسری جانب سر بفلک پہاڑ تھے اور پہاڑوں کی سبز ڈھلانوں پر جو کہیں کہیں ڈیلیا کے پھول کھلے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صانع قدرت نے فیروزہ پر عقیق و مرجان کی میناکاری کر دی ہے اور فاصلہ پر برف پوش چوٹیاں تھیں۔ جو اس وقت اس طرح چمک رہی تھیں جیسے ان پر کسی نے سیماب کی چادر چڑھا دی ہو چیل اور دیودار کے ہرے ہرے درخت ایک دوسرے کے دوش بدوش کھڑے تھے اور ان کی ڈالیوں پر سفید ڈاڑھیوں والے سیاہ لنگور بیٹھے ہماری طرف جھانک کر دیکھ رہے تھے اور دور کسی وادی کے دامن میں پہاڑی ندی کسی عاشق شوریدہ کے سر کی طرح شور و شغب کرتی [illegible]۔ نرگس! آج جو مجھے اس بوڑھے فریدون کا خیال آتا ہے اور اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو کچھ پوچھو نہیں جو میرے جی پر گذرتی ہے اس وقت میں جوان تھا اور وہ بوڑھا تھا۔ آج میں بوڑھا ہوں اور اسی کی طرح موت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ موت کے نام سے وحشت

ہوتی تھی ۔ لیکن آج موت میں ہی مجھے آرام کی جھلک نظر آ رہی ہے اور .....
............"

" بہرام جی !" نرگس بولی " یہ فلسفیانہ باتیں چھوڑیئے اور مطلب کی بات کیجیے ۔"

بوڑھے بہرام نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا ۔

" چائے بھی پیتے رہے اور گپ شپ بھی ہوتی رہی ۔ فریدون کبھی کبھی دوسروں پر کوئی ایسا فقرہ چست کرتا کہ سب ہنسنے لگتے ۔ کچھ دیر تو وہ ہمارے پاس بیٹھا رہا ۔ پھر یہ کہہ کر " جوانوں کے پاس بوڑھوں کا کیا کام " اٹھا اور دوسری جگہ جا بیٹھا ۔

نوشابہ کہنے لگی " آپ نے چائے تو پی ہی نہیں ۔"

" یہ دوسری پیالی تو ہے " میں نے پیالی ختم کرتے ہوئے کہا ۔

" کہاں دوسری ہے ۔" یہ کہتے ہوئے تیسری بار اس نے میری پیالی بھر دی ۔

میں نے پوچھا " آج آپ کچھ تھکی سی معلوم ہوتی ہیں ۔"

" آپ نے کیسے جانا ؟ "

" آپ چپ چپ جو بیٹھی ہیں شاید ناراض ہوں گی ؟ "

" ناراض !" نوشابہ بولی " کس سے ؟ "

" شاید مجھ سے ہی ہو ۔"

" وہ کیوں ؟ "

" کل میں نے آپ سے نام پوچھنے میں جو اصرار کیا ۔"

" وہ تو آپ محض انتقام لے رہے تھے ۔"

"انتقام!" میں نے تعجب سے پوچھا "کیسا انتقام؟"

"وہی اس روز گھٹنے پر چوٹ لگنے کا" نوشابہ نے ہنس کر کہا "ٹھیک کہا میں نے"

"یہ محض آپ کا خیال ہے"

"جب پتھر لگا تو چوٹ کیسے نہ آتی" نوشابہ بولی "درد کیسے نہ ہوتا"

"یہ ضروری نہیں" میں نے جواب دیا کہ "جس جگہ چوٹ لگے وہاں درد بھی ہو"

نوشابہ نے میری طرف دیکھا اور کہا "اس روز جو پتھر پھینکنے میں میرا بازو اکڑ گیا۔ تو درد بھی بازو میں ہی رہا"

"آپ کا بازو جو تھا" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ کا گھٹنا نہ تھا" نوشابہ نے چائے کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا "ہاں یہ فرمایئے درد کہاں ہوتا رہا؟"

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہاں"

اور نوشابہ ایک مستانہ ادا سے سر ہلا کر بولی۔ "ٹھیک!"

دل ہی تو ہے" میں نے جواب دیا "کوئی سنگ وخشت تو ہے نہیں"

"خیر!" اس نے کہا "آپ نے مان تو لیا کہ چوٹ بھی لگی اور درد بھی ہوا"

برابر کی میزوں والے چائے ختم کر چکے تھے اور ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ناچار ہمیں بھی اٹھنا پڑا۔

اس قدر کہہ چکنے کے بعد بہرام نے چائے کے دو چار گھونٹ پیے۔ نرگس نے پوچھا "بہرام جی چائے تو سرد ہوگئی ہوگی"

"نہیں ٹھیک ہے" بہرام نے جواب دیا۔ پھر اپنی داستان یوں شروع کی :-

"نرگس! فریدون بوڑھا تھا اور نوشابہ جوان۔ نوشابہ چاہتی کہ جب موقع ملے وادیوں میں گھوما کرے، پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھا کرے اور فریدوں کی یہ حالت کہ دس منٹ چلتا تو پندرہ منٹ بیٹھ کر دم لیتا۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں کی ملاقات کے بعد راہ رسم یہاں تک بڑھی کہ نوشابہ اب میرے ہمراہ سیر کرنے جایا کرتی۔

نرگس بولی" اور آپ اس شمشاد عزیب کو اتنی جلدی بھول گئے" پھر خاوند کی طرف دیکھ کر" بتاؤ تم مردوں کا اعتبار کون کرے؟"

"لو اور سنو" طاؤس نے ہنس کر کہا" نرگس تم تو مجھ پر برسنے کے لئے بس بہانہ ڈھونڈتی ہو۔ بات بہرام جی کی ہو رہی ہے اور قصور وار میں ٹھیرایا جا رہا ہوں۔ میں تو پہلی ہی نگاہ میں دل و ایمان سب تمہاری نذر کر چکا تھا لیکن تمہاری بناوٹی بے رخی سے جو میرا جی جلتا وہ میں ہی کچھ جانتا تھا"

"بناوٹی!" نرگس نے مسکرا کر کہا "ٹھیک!"

"ٹھیک نہیں تو اور کیا جھوٹ ...."

لیکن نرگس نے قطع کلام کر کے کہا" بس اب چپ رہیے" پھر بہرام سے" تو ہاں بہرام جی! وہ شمشاد عزیب دل میں کیا کہتی ہوگی؟"

بوڑھا بہرام بولا۔ نرگس! تم جانو کہ مرد کے دل کی نگرانی عورت کی محبت سے آباد ہوتی ہے اور جو عورت بے رخی کرے بے اعتنائی برتے تو پھر جو چرکے دل پر لگتے ہیں وہ دل ہی کچھ جانتا ہے اوّل تو شمشاد کے روکھے پھیکے خط سے مجھے ملال ہوا۔ پہاڑ پر آکر بھی کئی دن طبیعت خراب ہی رہی

دل میں جو شمشاد کا ایک تصور سا یا خیال سا بندھا ہوا تھا وہ رہ رہ کر دل کو بے چین کرتا۔ ایک خلش سی تھی جو اکثر بے قرار رکھتی۔ اب نوشابہ سے جو ملاقات ہوئی تو وہ خلش جاتی رہی۔ نرگس! عورت اگر محبت کا ایک لفظ بھی کہدے تو برسوں کا ناسور بھی مندمل ہونے لگتا ہے اور پھر ہم مرد تو کچھ اس قدر سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ پیار کی چھوٹی باتوں سے بھی مچل جاتے ہیں۔ اور........"

"بس رہنے دیجئے" نرگس نے پھر قطع کلام کرتے ہوئے کہا "خیر نوشابہ جو ملی تو غریب شمشاد دل سے اتر گئی۔ پھر کیا ہوا؟"

"لو اور سنو" بہرام بولا "یہ میں نے کب کہا کہ شمشاد کو میں بھول گیا؟ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ خلش جو شمشاد کی بے رخی سے پیدا ہوئی تھی نوشابہ کی ملاقات سے مٹ گئی۔ رہی یہ بات کہ پہاڑ پر آکر میں نے اسے خط کیوں نہ لکھا تو اس کی وجہ میں تمھیں پہلے ہی بتلا چکا ہوں۔"

نوشابہ سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے والدین مر چکے ہیں اور فریدون بابا جو اس کا دادا ہے اسی نے اسے پرورش کیا ہے اور وہی اس کا سرپرست ہے۔

اب ستمبر کا مہینہ تھا اور کہسار کی فضا میں ایک دلفریبی اور دلکشی نمودار ہو چکی تھی۔ ایک روز ہم اتفاق سے انھیں چٹانوں کے پاس بیٹھے تھے۔ نظر کے سامنے وہ سر بفلک پہاڑ تھے جن کی برف پوش چوٹیاں سکوت شام میں کچھ اس طرح نظر آرہی تھیں جیسے "نیلم پری" اندر کے اکھاڑے سے نکل کر سامنے آکھڑی ہو۔ چٹانوں کے اس طرف ایک بہت خوشنما وادی تھی اور کسی کسی جھاڑی کے نیچے سے کبک کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ہمارے

آس پاس جو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں ان میں کہیں کہیں عناب لگے تھے کچھ ہرے تھے اور کچھ پک کر سرخ ہو چکے تھے اتنے میں ایک چھوٹی سی خوب صورت چڑیا کہیں سے آئی اور ایک سرخ عناب توڑ کر اڑ گئی۔ نوشابہ مسکرا کر بولی "کیا تماشا ہے کہ ہر جان دار کو گھر کی ہی لو لگی رہتی ہے۔"

"آئین قدرت یہی ہے" میں نے کہا۔

"قدرت کے آئین بھی عجیب ہیں" نوشابہ بولی "انسان جب شادی کر لیتا ہے تو اسے علیحدہ گھر کی سوجھتی ہے۔ پرندے بھی جب اپنا جوڑ تلاش کر لیتے ہیں تو ماں باپ کا گھونسلہ چھوڑ کر کسی اور جگہ نشیمن بنا لیتے ہیں، پرندوں کو تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن جو آرام اور اطمینان انسان کو ماں باپ کے گھر میں ملتا ہے وہ اور جگہ مشکل سے میسر آتا ہے۔"

میں نے کہا: "یہ تو عورت پر موقوف ہے، وہ چاہے تو شادی کے بعد گھر کو جنت بنا دے چاہے جہنم۔"

"اور جو میاں ہی کوئی بگڑے دل ہوں تو؟" نوشابہ نے پوچھا۔

"مجھ سے سنئے" میں نے کہا "میاں ہزار بگڑے دل ہوں۔ اگر عورت کو "میاں" سے محبت ہو تو وہ گھر دونوں کے لئے جنت بن جاتا ہے۔"

"ہاں" نوشابہ بولی "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن محبت بازار سے تو مول نہیں لی جا سکتی۔ میرے خیال میں عورت کا دل مرد کے دل سے زیادہ نازک اور لطیف بنایا گیا ہے ذرا سی ٹھیس لگی تو بس زندگی حرام۔"

"لیکن ٹھیس لگے ہی کیوں؟" میں نے کہا۔

"مرد کے چلن سے" نوشابہ نے جواب دیا "منہ دیکھے کی محبت مرد کو ضرور ہوا کرتی ہے۔"

"اور عورتیں بھی بے مروت ہوا کرتی ہیں" میں نے مسکرا کر کہا: اور بے وفا بھی۔"

"تو گویا" نوشابہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ کو کسی بے وفا اور بے مروت سے بھی واسطہ پڑ چکا ہے؟"

"جی ہاں" میں نے کہا "پڑ چکا کیوں' پڑ رہا ہے۔"

"اور وہ نیک خصال ہے کون؟" نوشابہ نے ایک نگاہ غلط انداز سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"وہ ستم شعار اس وقت میرے قریب ہی بیٹھی ہے" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ستم شعار" نوشابہ سر ہلا کر بولی "بجا ارشاد ہوا اس روز آپ کا گھٹنا جو چھوڑ دیا تھا میں نے۔ سمجھ گئی۔ آپ کے سینہ سے ابھی تک وہ کاوش نہیں گئی"

"کاوش جائے کیسے" میں نے کہا "درد جو ہوتا ہے"

"درد!" اس نے بناوٹی تعجب سے پوچھا "کہاں؟ کب سے؟"

اور میں نے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہا "یہاں اور اسی روز سے۔"

"تو پھر اس کا علاج؟ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "جب مسیحا ہی مائل ستم ہو تو علاج کون کرے؟"

"خدا جانے آپ کیا فرما رہے ہیں!" نوشابہ نے منہ پھیر کر کہا: معلوم ہوتا ہے کہ کہسار کی آب و ہوا آپ کو راس نہیں آئی؟"

"راس تو تب آتی" میں نے کہا "جب کوئی حسینہ کہسار بھی مائل کرم ہوتی۔"

"حسینہ کہسار اور مائل کرم!" نوشابہ مسکرا کر بولی "خوب! لیکن کوئی لگنے والا بھی ہو۔ کوئی محتاج نظر بھی آئے۔"

میں نے لپک کر اس حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر دیوانہ وار ہاتھ چومنے لگا۔

وہ ہنس کر بولی۔ "دیکھئے کہیں ہونٹ بھی نہ دکھنے لگیں۔"

"ہوا کرے۔" میں نے کہا "اب جب چارہ گر موجود ہے تو درد کا کیا فکر۔"

"لیکن وہ دل کی خلش کیا ہوئی؟" نوشابہ نے میری آنکھوں سے آنکھیں ملا کر پوچھا۔ "دیکھوں تو درد ہے کہاں؟"

میں نے اس کا خوب صورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دل کے مقام پر رکھ دیا اور کہا "یہاں۔"

"بھلا سنوں تو آپ کا دل کہتا کیا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا خوب صورت سر میرے سینہ پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا سر بھی جھکنے لگا۔ پہلے سر سے سر ملا۔ پھر ہونٹ سے ہونٹ۔ ستمبر کی آخری تاریخوں میں پہاڑ پر ہی ہماری شادی ہوگئی۔



فریدوان اور دوسرے لوگ جو نوشابہ کے ساتھ پہاڑ پر مقیم تھے، چند روز بعد واپس چلے گئے ہیں اور نوشابہ وسط نومبر تک پہاڑ پر ہی رہے جب ہم لوگ واپس آئے تو سب سے پہلے میں نے شمشاد کے خطوط ایسی جگہ رکھ دئے جہاں نوشابہ انھیں دیکھ نہ سکے دل تو کئی بار چاہا کہ شمشاد کے خطوط ایسی جگہ رکھ دے جہاں نوشابہ انھیں دیکھ نہ سکے۔ دل تو کئی بار چاہا کہ شمشاد کو خط لکھوں لیکن

اب اس قسم کی خط و کتابت میں اخلاق سے گری ہوئی بات سمجھتا تھا۔ میری مسرت کی انتہا صرف یہ تھی کہ نوشابہ میرے پاس بیٹھی رہے وقت مزے سے گذرتا تھا۔ نوشابہ وائلن بجایا کرتی۔ میں پاس بیٹھ کر سنا کرتا۔ ایک روز میں نے کہا "نوشابہ مجھے بھی وائلن بجانا سکھا دو"۔

"سیکھ لیجیے۔ کچھ مشکل نہیں"۔

"کے روز میں سکھا دو گی۔؟"

"کیا فیس ادا کریں گے آپ؟"

"نوشابہ! میں نے ہنس کر پوچھا" مجھ سے بھی فیس لو گی"

"تو اور کیا مفت ہی؟"

"اور یہ جو میں سارا سارا دن تمہارے کاموں میں مارا مارا پھرتا ہوں میں نے کہا" کبھی میں نے بھی اجرت مانگی"۔

"مزدور کی مرضی ہے" وہ ایک جنبش جانانہ سے سر ہلا کر بولی" مانگے یا نہ مانگے"۔

"تو میں مزدور ہوا نا؟" میں نے کہا" چلو یوں ہی سہی۔ لائیے پہلے میرا حساب چکا دیجیے"۔

"کیا ہیں گے آپ؟" نوشابہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "ہر کوئی حساب کتاب آپ کے پاس؟"

"سرکار سے جو کچھ مل جائے وہی غنیمت ہے"۔ میں نے ہنس کر کہا

ع وہی مجھ کو عیش دوام ہے جو کرے تو ایک نظر سے خوش"۔

"تو ادھر آئیے" نوشابہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی" اٹھئے جلدی"۔

نوشابہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ میں سامنے جاکر کھڑا ہوگیا اور ہاتھ بڑھاکر کہا" لائیے "۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھلا لیا۔ اور پھر دونوں بانہیں میری گردن میں ڈال کر اپنا سر میرے سینہ پر رکھ دیا۔



فریدون گاہے گاہے ہمارے ہاں آجاتا اور دس پانچ روز رہ کر چلاجاتا۔ سردیوں کا موسم گذر چکا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ پہلے کچھ دن فریدون بابا کے پاس جاکر رہیں گے پھر کسی پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ اسے محض اتفاق سمجھئے کہ جب سفر کی تیاری ہونے لگی تو میں نے شمشاد کے خطوط نکالے اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک ایک کرکے پڑھنے لگا۔ میرا ارادہ تھا کہ جانے سے پیشتر انھیں تلف کردوں۔ ابھی دو ایک ہی خط دیکھے تھے کہ اچانک نوشابہ آگئی۔ میں نے سب خط اٹھاکر جیب میں ڈال لئے لیکن نوشابہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی" یہ کیسے خط ہیں جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟ "

" دو ایک دوستوں کے خط ہیں "۔

" دوستوں کے خط؟ پھر چھپائے کیوں۔ دکھائیے ذرا "۔

" تم دیکھ کر کیا لوگی؟ "

" بس ایسے ہی ذرا دیکھوں گی "۔

" تم تو پگلی ہوئی ہو "۔

" خیر پگلی ہی سہی! یہ کہہ کر نوشابہ زبردستی جیب میں سے جو خط نکالنے لگی تو میں نے ہنسی ہنسی میں اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس نے غصے سے میری

طرف دیکھا اور کہا۔
"سمجھ گئی کسی کُٹنی کے خط ہیں جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔"
"تمہارے سَر کی قسم ہرگز نہیں۔"
"تو پھر دکھا دیجئے۔"
"تمہارے دیکھنے کے قابل نہیں۔"
یہ سن کر وہ کمرے سے نکل گئی۔
میں ابھی بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ نوشابہ کے خط شمشاد کو دکھاؤں یا تلف کر دوں کہ اتنے میں فریدوں آیا اور چھوٹتے ہی مجھے کوسنا شروع کر دیا دنیا بھر کے الزام اس بڈھے نے میرے سر تھوپ دئے۔ پہلے تو میں خاموش بیٹھا رہا۔ آخر مجھے بھی غصہ آیا اور میں نے بھی دو چار سخت الفاظ کہہ دئے پھر میں نوشابہ کے پاس آیا وہ صوفے پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ میں نے بہت سمجھایا۔ ہزار قسمیں کھائیں، لیکن وہ اپنی ہٹ پر قائم رہی۔ میرے پیچھے پیچھے فریدوں بھی آگیا جانے یہ بوڑھا کچھ سٹھیا گیا تھا جو آگ پر اور بھی تیل ڈالنے لگا۔ میں نے بھی ضد میں آکر صاف کہہ دیا کہ اب جو ہو سو ہو لیکن خط قیامت تک بھی نہ دکھاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں باہر چلا گیا۔ شام کے بعد جب میں باہر سے آیا تو معلوم ہوا کہ نوشابہ اور فریدوں شام کی گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے ہیں۔

"توبہ ہے!" طاؤس بولا "ذرا سی بات پر اتنی ناراضگی۔"
نرگس بولی "بہرام جی! بات تو آپ نے بڑھائی۔ کیا حرج تھا جو آپ خط دکھلا دیتے تو۔"

"دوسرے کے خط کیسے دکھلا دیتے۔" بہرام نے جواب دیا "عورت کو مرد کی بات کا اعتبار ہونا چاہیئے۔ خیر! نوشابہ کے اس طرح چلے جانے پر مجھے بہت غصہ آیا کئی روز گذر گئے۔ نہ ادہر سے کوئی خط آیا نہ میں نے بھیجا غصہ تو دو چار دن میں جاتا رہا لیکن طبیعت بہت اچاٹ رہنے لگی۔ اب پھر ہی پرانا مشغلہ شروع کرنے کی ٹھانی۔ اخبار اور رسائل تو آتے ہی تھے ایک روز سب رسالے اکھٹے کر کے بیٹھا اور ایک ایک کی اوراق گردانی کرنے لگا لیکن جو چیز میں ڈھونڈھتا تھا وہ کہیں نہ ملی۔ رسالے دیکھنے سے جب جی اکتا جاتا تو میں شمشاد کے خط لے بیٹھتا۔ کئی روز اسی طرح گذر گئے۔ آخر ایک روز بیٹھے بیٹھے میں نے شمشاد کو ایک خط لکھا۔

بہرام نے اسی بیگ میں سے ایک خط نکالا اور پڑھنے لگا:۔

"میں خانگی معاملات میں اس قدر الجھا رہا اور ابلق ایام نے کچھ اس قدر پریشان رکھا، کچھ پوچھیے نہیں کہنے کو تو سال بھر ایک طویل عرصہ ہے لیکن جب غور کرتا ہوں تو کل کی بات معلوم ہوتی ہے جانے! وقت کیوں اتنی سرعت سے گذر جاتا ہے اور حالات کس طرح بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن معاف فرمایئے میں اتنا قصور وار نہیں جتنا کہ آپ مجھے خیال کرتی ہونگی۔ آپ کا آخری خط بہت مایوس کن تھا۔ اور پھر اس کے بعد آپنے کچھ ایسی چپ سادھی کہ بس توبہ ہی بھلی۔ ایک مدت سے آپکے رشحات قلم بھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ احوال واقعی جو کچھ بھی تھا گوش گذار کر دیا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

کئی روز کے انتظار کے بعد اس خط کا جواب منصوری پہاڑ سے آیا۔ وہ بھی سن لیجیے:۔

بہرام نے پھر ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگا:۔

" روز کاٹیج ـــــــ منصوری

"ایک مدت کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ شکریہ۔ بیشک واقعات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔ آپ کو ابلق ایام سے شکوہ ہے اور مجھے قسمت سے شکایت لیکن تعجب ہے کہ جب کوئی بات ہماری مرضی یا امید کے خلاف واقع ہوتی ہے تو ہم قسمت کو کوسنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ہر بات کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ بے شک میں نے ایک مدت سے کچھ نہیں لکھا دو چار روز ہوئے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا دس پانچ سطریں لکھ کر چھوڑ بیٹھی۔ چھوڑ کیوں بیٹھی؟ اس کی وجہ خود مجھے معلوم نہیں۔ خیر! جو کچھ لکھا ہے وہ آپ بھی سن لیجیے:۔

"بلبل نے جب تک بال و پر نہیں سنبھالے تھے۔ گھونسلے میں ہی بیٹھے بیٹھے پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتی۔ وہ منتظر تھی کہ اسے طاقت پرواز عطا ہو اور ہم صفیروں سے مل کر من مانی خوشیاں منائے۔ آخر اس کی یہ تمنا بر آئی۔ ایک روز وہ گھونسلے سے نکل کر شاخ پہ آ بیٹھی۔ اس نے ایک پھریری سی لی پھر پر تول کر اڑی اور چمن میں جا پہنچی۔ لیکن چمن کی سیر کا اسے اکیلے کچھ لطف نہ آتا۔ کچھ روز بعد اسے ایک ہمنوا مل گیا۔ دونوں نے مل کر اپنے لئے ایک نشیمن بنایا اور محبت سے رہنے لگے۔ لیکن یہ زندگی اسے راس نہ آئی اور بلبل کو پھر وہی اپنا پرانا آشیاں

یاد آنے لگا اور وہ اداس ہو کر پھر وہیں آ بیٹھی۔ لیکن دل کو جو ایک پھانس سی لگی تھی اس نے جینا حرام کر دیا۔ اس کی حالت اس پھول کی طرح ہو گئی جسے خزاں کے نفس گرم نے جھلس ڈالا ہو اور اب شاخ سے جھڑ کر مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کا منتظر ہو۔
بس اتنا ہی لکھا ہے۔ ہاں! آپ نے خط بھیجکر ایک پرانی یاد تازہ کر دی تو بے اختیار زبان سے نکلا کہ ؎

اس کوچہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی ۔ کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

ناشاد
شمشاد

نرگس! یہ خط پڑھ کر میرے دل پر ایک پرکا سا لگا۔ اسی رات بہ بہر دوار پسینجر پر سوار ہو کر دوسرے دن منصوری جا پہنچا اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے روز کوئی گیارہ بجے کے قریب میں شمشاد کے بنگلے کی جستجو میں نکلا۔ گرجا کے پاس سے پہاڑ کے ساتھ ساتھ داہنی جانب کو پگ ڈنڈی سی جاتی تھی۔ پگڈنڈی پر ایک چھوٹی سی چٹان کے عقب میں سرخ رنگ کی ایک خوب صورت عمارت تھی۔ یہی "روز کاٹیج" تھی۔ کوٹھی کے جنوب کی جانب یعنی اسی طرف جدھر سے میں گیا تھا چیل کے درخت تھے۔ اور ان کے آگے گھاس کا ایک چھوٹا سا سرسبز قطعہ تھا۔ یہاں ایک آرام کرسی پر ایک عورت بیٹھی کوئی اخبار دیکھ رہی تھی۔ نرگس! یہ نوشابہ تھی ......

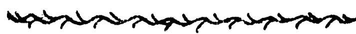
"نوشابہ!" نرگس نے تعجب سے پوچھا۔

"شمشاد کہیے" طاؤس بولا۔

پھر آہ سے! ایک گہرا سانس لے کر کہا "نوشابہ بھی اور شمشاد بھی"

وقت جو میری حالت تھی بیان نہیں کر سکتا۔ میں دبے پاؤں اس کی کرسی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ پھر اچک کر اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ کر اور ہنس کر کہا " شمشاد ! "

وہ بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھی اور میری طرف دیکھ کر بولی " بہرام ! " یہ کہتے ہی وہ میرے سینے سے چمٹ گئی۔



آفتاب ناسپاتی کے پیڑوں کے عقب میں غروب ہو رہا تھا اور شفق کی ہلکی ہلکی سی سرخی فضائے عالم میں پھیل رہی تھی۔ اب نہ آم پر سے کوئل کی آواز آتی تھی اور نہ قمری کی کوکو ہی سنائی دیتی۔ ہاں! کسی پیڑ پر سے کسی وقت " پی کہاں " کی آواز سنائی دی جاتی۔ بوڑھا بہرام سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

ایم اسلم

فطرت کے دو زاویئے

"بیہوشش"

"غش"

"ہش"

"فش"

"کیوں کیا بات ہے؟" میں نے سرگوشی میں عظیم سے پوچھا۔

"ہش" اس نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیا حرکت قلب بند ہو گئی؟" میں نے اپنے دوست کی دفعتاً بیہوشی پر سنجیدہ ہو کر اس بار نسیم سے دریافت کیا۔

"فش" اس نے حقارت سے منہ بنا کر جواب دیا۔

"لاحول ولا قوۃ اس ہش، اور فش کے علاوہ اور بھی منہ سے کچھ پھوڑو گے

یا نہیں ؛ بتاتے کیوں نہیں کہ میرا دوست مرگیا یا زندہ ہے ؟" میں نے بیہوش اجمل (جس کا " قلمی نام" ناظر تھا) کے سرہانے ہو کر شکایتاً نسیم وعظیم سے دریافت کیا۔

" یہ لو یہ ہے اس بیہودہ انسان کی بیہوشی کا باعث۔ یہ قرطاس رنگین۔ یہ زہر خوش رنگ" نسیم نے میری طرف ایک خط پھینک کر کہا میں نے جو اس کو پڑھا تو یہ نسوانی تحریر تھی۔

"اچھے ناظر!

تمہاری پاک محبت کا پیام کس درجہ شیریں ہے۔ لیکن کس قدر رقت انگیز۔ تمہاری تحریر میں زبردست جادو ہے ایسا جادو جس کے موکل کیوپڈ اور وامق ہی ہو سکتے ہیں۔ لیکن تمہارے خط سے مجھے ایسا شبہ ہوتا ہے کہ تم نے محبت اپنے اوپر خود انگیز لی ہے۔ محبت کو اپنا بے خطا موقع نہیں دیا کہ وہ تمہارے گرد خود قوی حصار قائم کر لیتی۔ میری اس تشکیک کو معاف کرنا۔ میں دراصل پریم کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتی بھی نہیں ہوں۔ تم میری اس عدم تفہیم کو " ابا " سے تعبیر کرتے ہو یہ تمہاری غلطی ہے اسے لیکن تم نے یہ کیا لکھ دیا کہ ہم قیامت تک نہیں ملیں گے ملیں گے کیوں نہیں آخر ؟ تمہارے اور میرے درمیان ایسی کونسی آگ کی خلیج حائل ہے مجھے سمجھاؤ مجھے بتاؤ۔

دیکھو ناظر! تم رموز و نکات کے پردے میں لپیٹ کر بات کرنیکے عادی اور میں اس کے برعکس ہوں سیدھی سادی بات سمجھنے والی۔ بھلا اس سوال کو اس طرح مبہم طور پر پیش کرنیکی

کیا ضرورت تھی کہ کیا میں تم سے نفرت کرتی ہوں مجھے بظاہر تو تمہارے اندر کوئی نفرت انگیز بات نظر آتی نہیں ہے۔ کیا اچھا ہو ناظر کہ تم عملاً بھی اپنے اطوار و اخلاق میں اسی قسم کے سرگرم محبت انسان ہو جیسے خطوں میں نظر آتے ہو۔ خدا کرے تحریر کی پرکاری تمہارے حقیقی جذبات کی آئینہ دار ہو۔ میں تو تمہارے ابتدائی خطوط سے ہی تاڑ گئی تھی کہ تمہارا دل مجھ سے کچھ بات کہنے کو چاہتا ہے ..... تمہارے خط شروع سے "ربودگی" کی ایک خفیف سی لچک اپنے اندر پنہاں رکھتے تھے۔ کیوں جناب مانتے ہیں۔ آپ یا نہیں؟ میں جانتی تھی کہ اب تمہارے زور گسل جذبات اس سطح تک پہنچ کر آیا چاہتے ہیں جہاں تم ان کے سیلاب میں سنبھالے نہ سنبھلو گے۔ دو ناآشنا مرد و عورت کی طویل باہمی خط و کتابت کو اگر کوئی وجدانی سراغ رساں جانچ کر اپنی تفتیش مرتب کرے تو اس تفتیش کا متن صاف طور پر "آرزو اور شوق ہوگا۔

ہیں، نہ معلوم کیا بہکی بہکی باتیں کرنے بیٹھ گئی۔ مجھے ابھی تمہارے اس رندانہ پیام کی پذیرائی کرنی ہے جس کو تم نے اس ناآشنا الفت کے پاس پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لو سنو میں راستبازانہ طور پر تم سے کہتی ہوں کہ .... میں تم سے نفرت نہیں کرتی کوشش کروں تب بھی نہیں کر سکتی، بس اب تو مطمئن؟

تمہارے اقدام محبت سے متاثر

ناظرہ "

عجیب خط تھا۔ راقمہ باتیں تو آزمودہ کار لوگوں کی سی کر رہی تھی

لیکن کہتی ہے اپنے کو نہایت بھولی بھالی۔ عورت کی یہ ہمہ دانی لئے ہوئے سادہ بیانی بھی کس قدر عجیب وغریب ہوتی ہے۔ خیر میں خط پڑھ کر بولا" اچھا تو میرا دوست انجم محبوب کے اس محبت نواز خط کو پڑھ کر بے ہوش ہوگیا ہے ؟ لیکن تم لوگ بڑے بے رحم ہو۔ اس کی بے ہوشی کا مذاق اڑا رہے ہو۔ جاؤ جلدی سے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ" عظیم بڑبڑاتا ہوا ڈاکٹر کو لینے چل دیا۔

"ہو سکتا ہے کہ تم میرا ہاتھ مروڑتے مروڑتے مجھے اس قدر تکلیف میں مبتلا کردو کہ میں رونے لگوں، مگر میں حتی الوسع ضبط کرنے کی کوشش کرونگا تم کو معلوم ہونا چاہیئے، کہ اگر تم اس کو اسی بے رحمی سے موڑتے رہے تو وہ ابھی کہنی پہ سے جدا ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی تم سے پوشیدہ نہ رہے کہ پرسوں میرے شانہ میں ہاکی کھیلتے ہوئے سخت چوٹ آچکی ہے۔ انجم نے احساس تکلیف کے باوجود مزاحاً کہا۔

" جب تک تم مجھے اپنی ناظرہ کے تمام خطوط نہ دکھا دوگے اس وقت تک تمہارا ہاتھ مڑتے مڑتے لوٹ جانے کے خطرہ میں ہے اور میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اپنی ایک اور کمزوری سے آگاہ کر دیا۔ لاؤ میں تمہارے ماؤف شانے کی بھی تواضع کر دوں۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے شانے کو چھونا چاہا لیکن اس نے فوراً الماری کی چابی میری طرف پھینکدی میں اطمینان سے ناظرہ کے خطوط پڑھتا رہا اور وہ غریب بیٹھا ہوا اپنے ہاتھ کو سہلاتا رہا۔

اگر آپ کسی کے طرز تحریر سے کاتب کا کیریکٹر پڑھ لینے کے مدعی ہیں

تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اولین فرصت میں اپنے اس مغالطہ کی اصلاح کیجئے
مضامین وخطوط دراصل لکھنے والے کے حقیقی جذبات کے بہت کم ترجمان
ہوتے ہیں۔ اگر ہارڈی اپنے اخلاق وکردار میں بھی وہی ہارڈی تھا جیسا کہ
کہ وہ اپنے ناول........"Jud the obscure" کے اندر
نظر آتا ہے تو اہرمن (بشکل انسان) کے وجود کا انکار کرنا سخت حماقت ہے
ایک ادیب اپنے مضامین کے اندر ادیب ہوتا ہے۔ اگر وہ گفتگو میں بھی
ادیب ہے تو صبر کر لینے کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اخلاق وعادات
میں بھی ادیب ہے اور میل جول کے طریقوں میں ادیب ہے تو اس شخص
کو بہت جلد کسی الماری میں کتابوں کے ساتھ بند کر دینا چاہیئے۔ ناظرہ اگر
ایسی ہی رومانی سیرت، ایسے ہی محبوبانہ اخلاق اور اسی قسم کی "نوازش
ہائے بیکراں" کی حامل ہستی تھی جیسی کہ وہ خطوط میں نظر آرہی تھی تو مجھ خدا
کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرنے کے باوجود موحد کہلانے کا مستحق تھا!
ناظم! دیکھو ناظرہ کیسی جذبات نواز، کس قدر اخلاق پرور اور کتنی نیک
نفس لڑکی ہے۔ بھئی میں اپنی قسمت پر ناز کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ صوفے
پر میرے قریب آبیٹھا" اچھا یہ بتاؤ تم نے اپنے خطوط میں کیا کیا حماقت
نگاری کی ہے" میں نے ناظرہ کے خطوط ختم کر کے کہا۔
"دیکھو جی! تم اب تک بزرگوں کی طرح میرے ساتھ پیش آتے
رہے ہو اور میں بھی سعادت مندی برتتا رہا ہوں۔ لیکن اب بغاوت کر کے
کہتا ہوں کہ تم نے اگر والد کی شان مستعاراً دکھائی تو دست درپیش کے
عوض دست وگوش "۔
" فضول بکواس نہ کرو۔ میری بات کا جواب دو۔ کیا تم اس سے محبت

کرتے ہو ؟"

"ناظم ! بات یہ ہے کہ ناظرہ ایک نہایت ہی شائستہ و نیک لڑکی ہے میں اس امر کا تو مدعی نہیں کہ اس کی پرستش کرتا ہوں کیونکہ میں نے اس کو دیکھا بھی نہیں ہے "

مگر تم کو معلوم ہے :-

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

"لیکن مجھے تو ابھی موقع گفتار بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس کے خطوں کو پڑھ کر میں نے یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ محبت مجسم ہے" اجمل نے کہا۔

محبت کی تجسیم کا قائل ہونے سے قبل میں تمہارے اصلاح خیال کی غرض سے کہنا پسند کروں گا اگر محبت کا جسم ہی اختیار کرنا ممکن تصور کر لیا جائے تو وہ کم از کم ناظرہ کے جسم میں تو پناہ نہیں لے سکتی۔ ممکن ہے میری اس آزاد و بیانی سے تمہارے والہانہ جذبات مجروح ہو جائیں لیکن اجمل میں تم کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ قیس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے قبل خدا کی دی ہوئی اس قوت سے ایک بار اور کام لے لینا جس کو عرف عام میں عقل کہتے ہیں" میں نے کہا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میری نصیحت کا اس پر کیا اثر ہوا۔ لیکن اس کی ہر حرکت سے مبالغہ کے ساتھ شعریت سرزد ہوتے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص اب تک

نیاز شیوۂ ما عاجزان محتاج است

کی تکمیل کی پوری پوری کوشش کر رہا ہے۔ کس لیے ؟ اس کے جواب

میں اس کے دل کی حملہ آور ناظرہ کے سوا اور کس کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناظرہ اپنے الفاظ کی قوت سے ایک ایسی مدت کے لئے جس کی کوئی میعاد تعین نہیں کی جا سکتی اجمل کی دلنشین ہو چکی تھی۔ اس قسم کی دلنشینی میں آپ خود غور کر لیجئے کہاں تک استواری ہو سکتی ہے۔ زنانہ مکاتیب کے بنائے ہوئے محبوبانہ خاکے اس وقت تک دلوں میں مرتسم رہتے ہیں جب تک کسی جیتے جاگتے خاکے کی برقی شعاعیں لوح دل پر نہیں پڑتی ہیں جب "حسن مقید آب و گل" سے سامنا ہو جاتا ہے تو تخیلی خاکے نیا منیا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ حسن وجودی لے لیتا ہے۔

تین روز سے اجمل مجھ سے اصرار کر رہا تھا کہ لاہور چلیں۔ میں جانتا تھا کہ اس سفر میں وہ امرتسر قیام کر کے ناظرہ سے بھی ملاقات کرنے کی کوشش کرے گا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس ملاقات میں کامیابی حاصل کرنے کی جد و جہد میں وہ کوئی مجنونانہ حرکت نہ کر بیٹھے گا۔ چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ امرتسر اس کو نہیں اترنے دوں گا۔

لاہور پہنچ کر ہم اپنے ایک "قلمی دوست" کے ہاں ٹھیر گئے۔ سردی کا زمانہ تھا اور لاہور کی سردی۔ رات کو سینما جانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی آخر اجمل کے اصرار پر ہم دونوں ایک روز ایک مشہور سینما میں جا دھمکے۔ آج کل سینما میں لطف دوگونہ حاصل ہوتا ہے۔ تماشا دیکھنے کا اور محو تماشا حسین.... تماشائیوں کو دیکھنے کا لطف! ع انھیں کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں۔

اختتام تماشا پر میں اور اجمل کسی ٹیکسی کو پکڑنے کی فکر میں تماشا گاہ کے باہر کھڑے ہوئے تھے ہماری نظروں سے تماشا پر رائے زنی کرتے ہوئے نام نہاد نقادوں کا سیلاب گذر رہا تھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے سینما

کی شوقین وہ لطیف ہستیاں گذر رہی تھیں جو اپنے برق پاش تبسم کی صاعقہ سامانی اور "مہ ناوک نگاہی" کا مظاہرہ اس شاہانہ طرز سے کیا کرتی ہیں کہ "کسے خبرے نہ شد" اور ہلاک ہونے والے ہلاک ہو جایا کرتے ہیں۔ ہماری نگاہوں کے آگے سے ان حسرت پرست سوختہ ساماں بدقسمت نوجوانوں کا گروہ گذر رہا تھا جن کے بے برگ و بار نخلِ تمنا کو پھر سرسبز کر دینے کا وعدہ کسی بت حیلہ گر نے کر لیا تھا۔ لیکن اب بجان استغنا منہ موڑ کر چل دیا تھا۔ غرض ہم سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

"ارے یہ کیا؟" اجمل نے مجمع کی طرف جو دفعتاً اکٹھا ہو گیا تھا اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو دیکھیں" ہم دونوں لپک کر پہنچے۔ اف! عجیب نظارہ تھا۔ ایک خاتون کی ساڑھی میں آگ لگ رہی تھی اور وہ ہولی کی طرح کھڑی ہوئی جل رہی تھی۔ لوگوں نے پانی نہ ملنے کے باعث سوڈا واٹر کی بوتلیں اس کے کپڑوں پر خالی کرنا شروع کیں۔ لیکن آگ کے بے رحم شعلے اس کے بالائی حسین حصہ جسم پر اپنے آتشیں بوسے ثبت کرنے پر اصرار کئے جا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سے مٹی مل جائے تو اس خاتون پر جلدی سے ڈال دوں۔ مگر تارکول کی سڑک پر مٹی کہاں! دفعتاً جانبازہ اجمل آگے بڑھا اور بہت تیزی سے اپنا اوورکوٹ اتار کر خاتون کے تن سوزاں کے گرد لپیٹ دیا۔ خاتون تڑپتے تڑپتے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کو صرف اتنا یاد تھا کہ کسی حوصلہ مند مرد نے کسی شے میں لپیٹ کر اس کو گود میں اٹھا لیا تھا۔

مجمع کے منہ سے داد تحسین کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے لیکن سراسیمہ اجمل نے ان کی جانب توجہ نہیں کی۔ ایک بزرگ صورت معزز

آدمی جو خاتون کے بہت قریب کھڑا تھا اور اس کی آگ بجھانے کی سعی بیکار میں اپنی انگلیاں جلا چکا تھا اس سے متشکرانہ لہجہ میں بولا " مہربان میں آپ کا بجید ممنون ہوں۔ آپ نے میری بچی کی جان بچالی " یہ کہہ کر اس نے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کیا۔ اجمل نے بیہوش خاتون کو اس میں لٹا دیا۔

" کیا عزیز! تم چلے جانے کا ارادہ کر رہے ہو؟ کیا تم میرے غریب خانہ تک چلنے کی زحمت نہیں کرو گے؟ آہ کیا خبر میری بچی کی رات کو کیا حالت ہو جائے " بزرگ صورت نے بکمال اندوہ کہا

" اگر آپ مجھے اپنے ہمرکاب چلنے کی اجازت دیتے ہیں تو مجھے عذر نہیں۔ ناظم (میں بھی ٹیکسی کے پاس آگیا تھا) کیا تم لپک کر کسی ڈاکٹر کو بلا لوگے حضرت! ان میرے دوست کو اپنے مکان کا پتہ بتا دیجئے " اجمل نے بڈھے سے کہا۔ میں بڑے میاں سے پتہ معلوم کر کے فوراً ڈاکٹر کو لینے چل دیا۔ راستہ میں مجھے خیال آیا کہ لیڈی ڈاکٹر کو لے چلنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ خاتون کا زیریں حصہ جسم زیادہ ماؤف ہے۔ جس کو برہنہ کرنا شاید وہ ڈاکٹر کے آگے مناسب نہیں سمجھے گی۔

خدا خدا کر کے ایک قبول صورت (قبول صورت تو وہ اتفاق سے نکل آئی میری تلاش کو اس میں کوئی دخل نہ تھا) لیڈی ڈاکٹر ہاتھ لگی۔ لیکن وہ رات میں ایک ناآشنا کے ساتھ نکلنے میں کرنے لگیں تکلف۔ میں نے ان کو شریفانہ طور پر کہہ دیا کہ اگر وہ اپنے اطمینان کے لئے شہنشاہ جارج پنجم کے باڈی گارڈ کو ساتھ لینا چاہتی ہیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔ وہ ہنسنے لگیں اور اپنے بڈھے چوکیدار کو (جو ان کی حفاظت کے موقع پر شور مچا کر صرف لوگوں کو جمع کرنے کے کام آسکتا تھا) ہمراہ لے لیا۔ ہم گاڑی میں آ

بیٹھ گئے اور بڑھے کے مکان کا رستہ لیا۔ میں نے مریضہ کی کیفیت ڈاکٹر سے بیان کر ہی دی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق راستہ میں مجھ سے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ میں حادثہ کا اور اجمل کی صحیح خدمات کا خیال کر رہا تھا کہ لیڈی صاحبہ کے ایک سوال نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟"

"بفضلہ نہیں"۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مجرد؟ انھوں نے میرے جواب سے مطمئن نہ ہو کر پوچھا۔

"الحمد للہ!" میں نے کہا۔

"تو اب پھنسے آپ" خوش مزاج لیڈی صاحبہ نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"وہیں اس مریضہ کے دام . . . . اس مریضہ کے گھر میں" انھوں نے کہا۔

"آپ شاید دام گیسو فرما رہی تھیں۔ آپ نے ناحق شعریت کو کرختگی سے بدل ڈالا ہاں تو یہ حسن خیال آپ نے کس بنا پہ قائم کیا؟" میں نے پوچھا

"آپ نے ایسے قصے غالباً ناولوں میں پڑھے ہوں گے، ایک نوجوان کو حوادث و اتفاقات کسی حسینہ کے جادہ حیات کے درمیان لے آتے ہیں" لیڈی صاحبہ نے کسی قدر حیا آگیں لہجہ میں کہا۔

"مگر لیڈی صاحبہ" یہ عشق آفریں حادثہ" فی التحقیقت کسی مرد کو کسی حسینہ سے دوچار کرا رہا ہے تو بدقسمتی سے وہ مرد میں نہیں ہوں، بلکہ میرا ایک دوست ہے چنانچہ اپنے آزاد رہنے پہ مجھے ایک نعرہ مسرت بلند کرنے کی اجازت دیجیے! آہ لیکن نہیں۔ میرے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آگیا ہے . . . . . .

اجازت ہو تو عرض کروں!" میں نے کہا۔

"سنائیے، سنائیے" انھوں اشتیاقانہ پوچھا۔

"میں بھی اس رات کو پروان بار بار ہوں وجہ ...... کیا بتاؤں زبان یاری نہیں کرتی خیر سنئے۔ ادھر میرا دوست حادثتاً ایک خاتون کے حیادثہ زندگی میں جا کھڑا ہوا ہے۔ ادھر اتفاقاً میں ایک لیڈی کے ساتھ ایک گاڑی میں اڑا ہوا جا رہا ہوں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں اس سے قبل میں نے کسی خاتون کے اس قدر قریب بیٹھنے کا فخر حاصل نہیں کیا جس قدر آنجنابہ کے متصل جگہ ملنے کا آج شرف حاصل ہوا ہے۔ یہ ہے میری زندگی کا اولین بار رومان۔ اب سے

آپ چاہیں تو مرادیں مری پوری کر دیں تو کام اپنا ہے فقط عرض تمنا کرنا

بنا زمند آداب عرض کرتا ہے" میں نے لیڈی صاحبہ کے سنجیدہ بشرے کی طرف دیکھا جس پر میری نقالانہ حرکات سے تبسم خفی کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔

"آپ عجیب منہ پھٹ انسان ہیں" لیڈی صاحبہ نے نیچی نظروں سے فرمایا۔

"خطا معاف آپ ہی نے پہلے دعوت رومان دی۔ آپ ہی سے لطیف جذبات مجھ پر مسلط کئے۔ اگر ارشاد ہو تو میں پھر صحرائے عرب کی طرح جادو نشاں بنا جاتا ہوں لیکن یہ واضح رہے سے

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
کہتے کسی کو سنئے گا تو بہروں سر کو دھنئے گا

اس اثنا میں مریضہ کا مکان آ گیا۔ میں لیڈی ڈاکٹر کو لے کر اندر داخل ہوا تو بڈھے نے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا

لیڈی صاحبہ نے مریضہ کی صورت دیکھ کر حیرت سے کہا: "ہیں! مس یوسف میں ان کو خوب جانتی ہوں۔ اچھا تو جناب ہیں مسٹر یوسف! یہ ایک دوبار مجھ سے مل چکی ہیں۔"

"میں اپنے زمان کا واسطہ دے کر آپ سے کہتا ہوں کہ ان کا علاج ذرا توجہ سے کیجئے گا" یہ فقرہ میں نے آہستہ سے کہا۔ لیڈی صاحبہ نے اجمل کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ اجمل نے جھینپ کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ اچھا جناب ہیرو صاحب اور نیم ہیرو صاحب (یہ میں تھا) آپ براہ کرم ذرا کمرہ خالی کر دیں" حسین ڈاکٹر نے کہا۔ ہم اس "نیم ہیرو" کے جانثار لفظ پر سمجھے کہ پھنسیں لیڈی صاحبہ۔ چنانچہ عاشقانہ اثرات اپنے چہرے پر پیدا کر کے ان کی جانب دیکھتے ہوئے باہر جانے لگے۔ لیکن جواباً انہوں نے ہم کو یہی "عشق ناکارہ" اور "محبت چھڑاؤ" نظر سے دیکھا کہ ہم دل میں سخت خفیف ہوئے اور سینے پر سر لٹکائے باہر نکل آئے۔

ناظم! کس قدر حسین لڑکی ہے وہ!" اجمل نے بیمار خاتون کے متعلق کہا۔ پیشانی اگرچہ زیادہ بلند نہیں ہے لیکن ابروؤں کے قاتلانہ خم نے اس کی بہت بڑی حد تک تلافی کر دی ہے۔ کیوں جی! کسی حسین یا غیر حسین انسان کو دیکھنے کے بعد اس کے متعلق جو اثرات اولین پسندیدگی یا نفرت کے پیدا ہو جایا کرتے ہیں وہ عارضی ہوتے ہیں یا مستقل؟" اجمل نے دریافت کیا۔

وہ ہوتے تو ہنگامی ہیں۔ لیکن جب "مشہود" سے تمہارا سابقہ پڑتا ہے اور تم اس کے اخلاق سے بھی متاثر ہوتے ہو تو اس وقت کے ارتسامات "دیرپیوند" ہوتے ہیں۔ تم شاید آرزو محسوس کر رہے ہو کہ یہ لڑکی دائمی طور پر تمہارے قبضہ میں رہے اسی "حسین وہم" کا نام محبت ہے۔ خیر تو تم۔۔

اصطلاح عام میں اس پر عاشق ہو چکے ہو" میں نے کہا۔

"عاشق تو بہت وزنی لفظ ہے۔ لیکن میں اس لڑکی کو اپنی روح کی بلند ترین سطح پر متمکن پاتا ہوں۔ اسی خیال کی استواری کا نام محبت ہے، نا کہ تمہارے بیان کردہ بیہودہ مقالہ کا" اس نے کہا

"آپ لوگ اندر آ سکتے ہیں" آدھ گھنٹہ بعد لیڈی صاحب نے اندر سے آواز دے کر ہم کو کہا۔ چنانچہ اجمل حریصانہ مجروح خاتون کو اور میں دزدیدہ نظروں سے لیڈی صاحبہ کو دیکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

لیڈی صاحبہ نے سنسان رات میں سنگدلی کے اندر مجھ سے گفتگو کر کے میرے ننگ محبت دل میں گدگدی سی پیدا کر دی تھی۔ اب جو میں ان کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ چتون بدلنے لگیں اور جب چپ چاپ بیٹھ گیا تو سقراط کا شاگرد کہہ کر میرا مذاق اڑانے لگیں عجیب مصیبت تھی۔

مجروح حسینہ کو ہوش آ چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی غلافی آنکھیں وا کر کے حیرانی سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد زخموں کی سوزش سے کراہنے لگی یکے بعد دیگرے اس کو تمام واقعات یاد آنے لگے تو اس نے کمرے کی "موجودات" میں اس ہستی کو تلاش کرنا شروع کیا جس نے سر گرمی سے آگ بجھا کر اس کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ اس کا باپ آبدیدہ آنکھوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ لیڈی صاحبہ اس کے قریب آئیں اور بولیں "ہلو مس یوسف! تم کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑا رنج ہے۔ اطمینان رکھو خدا کے فضل سے تم کو زیادہ گزند نہیں پہنچی ہے۔ تم کو ان دونوں حضرات کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے بروقت تمہاری مدد کی"

"میں عمر بھر آپ حضرات کا زیر بار منت رہوں گا" حسینہ کے والد

نے اپنی بیٹی کی جانب سے شکریہ ادا کر کے کہا۔

"آپ کے شکریہ کا تمام تر مستحق میرا دوست اجمل ہے" میں نے کہا۔

"اچھا جناب کا اسم گرامی اجمل ہے؟ آپ شاید یو۔پی کے باشندہ ہیں؟" یوسف نے کہا۔

"آپ کا قیاس درست ہے۔ دہلی وطن ہے یہاں تفریحاً آئے ہوئے ہیں۔" اجمل نے مجروح حسینہ کے سرہانے کرسی لے جاتے ہوئے کہا۔ حسینہ بہت کم ہماری گفتگو کی جانب متوجہ ہوئی صرف کبھی کبھی وہ اجمل کی جانب ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لیا کرتی۔

"آپ کا کیا نام ہے؟" لیڈی صاحبہ نے جھکے سے مجھ سے پوچھا۔

"میرا نام ناظم ہے" میں نے اس کو سنانے کے لئے ذرا زور سے کہا تاکہ سب سن لیں۔ بغیر سوال کئے اس طرح خود بخود اپنا نام بول نعرۂ جنگ کی طرح ظاہر کرنے سے ہر شخص مجھے حیرت سے دیکھنے لگا اور لیڈی صاحبہ نے تو ایسی قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا کہ میں اگر کسی آتش گیر مادہ کا بنا ہوا ہوتا تو ان کی شعلہ ریز آنکھوں کی قوت سے جل کر بھسم ہو جاتا۔ یوسف صاحب کے چہرے پر بھی آثار تبسم تھے وہ بولے۔ "آپ کا اسم گرامی دریافت نہ کرنے سے شاید آپ کو ناگوار گزرا ہے۔ معاف کیجئے گا۔ میں ممنون ہوں کہ اپنے اسم گرامی سے بھی آپ نے آگاہ فرما دیا۔"

"کہئے کیسی رہی؟" میں نے آہستہ سے لیڈی صاحبہ سے کہا جو غصہ سے اٹھ کر دور جا بیٹھیں۔

"اچھا جناب اب اجازت دیجئے" میں نے اپنی ٹوپی کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"توقع ہے کہ آپ حضرات صبح بھی تشریف لائیں گے" مسٹر یوسف نے کہا
"ضرور! اگر اجازت ہو تو میں آپ کو واپس مکان بھی پہنچا دوں" میں نے لیڈی صاحبہ سے کہا۔

"شکریہ! اب واپسی میں آپ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے" ناراض لیڈی صاحبہ نے نتھنے پھلا کر جواب دیا۔ اجمل نے مریضہ کے سرہانے جھک کر پہلی بار اس سے یہ غیر مسلسل فقرے کہے "آپ زیادہ پریشان نہ ہوں ...... انشاء اللہ جلد صحت یاب ہو جائیں گی میں دونوں وقت مزاج پرسی کو حاضر ہوا کروں گا ——" مریضہ نے تشکرانہ نگاہوں سے اجمل کی جانب دیکھا اور خفیف آواز میں اس کا شکریہ ادا کر کے چپ ہو گئی۔ لیڈی صاحبہ نے بھی صبح آنے کا وعدہ کیا اور اپنی دواؤں کا بکس اٹھا کر چلنے لگیں مگر میں نے لپک کر بکس ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ اور ہم مکان سے نکل کر گاڑی کی طرف چل دیئے۔ اجمل کوٹ دینے پہنچنے میں پیچھے رہ گیا تھا۔ لیڈی صاحبہ جب گاڑی میں بیٹھ گئیں تو میں نے معذرتاً کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری اس حرکت سے آپ کو صدمہ پہنچا کیا آپ مجھے معاف فرمائیں گی" اس کے جواب میں اس بت طناز نے منہ پھیر لیا۔ معذرت کے جو الفاظ شایاں تھے وہ میں صرف کر چکا تھا۔ اب "پیش دستی" کا ہی باقی تھا۔ لیکن اتنی جرأت کہاں سے لاتا۔ آخر میں نے پھر حلق پھاڑ کر کہا۔ دیکھئے آپ خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہیں آپ نے ہم کو نیم ہیرو کہہ دیا تو ہم نے چوں تک نہ کی۔ مگر آپ ہیں کہ ہماری اس ذرا سی حرکت پر خفا ہو گئیں"۔

"نیم ہیرو کہہ دینے میں کیا مضائقہ تھا" لیڈی صاحبہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

١٣٣٦

لیجئے آپ کے نزدیک کوئی مضائقہ ہی نہیں۔ آپ نے ہمارے دوست کے سامنے ہماری توہین کردی۔ اس کو تو پورا ہیرو بنایا اور ہم کو نیم ہی رہنے دیا میں نے یہ کچھ ایسی رونی صورت بنا کر کہا کہ لیڈی صاحبہ کو ہنسی آگئی۔ میں نے جھک کر ایک فرشی سلام کیا اور منتظر اجمل سے آملا۔

"یہ لیڈی صاحبہ آپ سے بہت مانوس ہوگئی ہیں" وہ بولا۔

"نہیں جی مانوس وانوس کچھ نہیں ہوئی ہیں۔ خوش اخلاق عورت ہے۔ ہر ایک سے بات کرنے کی عادی ہے" میں نے کہا۔

اپنی فرودگاہ پر آکر میں تو آرام سے سوگیا۔ کیونکہ جس طرح "خالی دل" لے کر گیا تھا اسی طرح اس کو بے داغ واپس لے آیا۔ لیکن اجمل اس خاتون کے کپڑوں کی آگ بجھا کر اپنے دل میں آگ لگا لایا تھا۔ اس کی انگلیاں جابجا سے جھلس گئی تھیں لیکن جگر اس سے بھی زیادہ جھلس گیا تھا ؎

ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر   درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

میرا خیال ہے کہ وہ شب بھر نہ سو سکا تھا۔ کیونکہ صبح اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے کپڑے پہنے اور یوسف صاحب کے مکان پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میرے سر میں سخت درد ہو رہا تھا چنانچہ میں نہیں گیا۔

اجمل صبح کا گیا ہوا شام کو لوٹا۔ اس نے صبح کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ میں نے اس طویل غیر حاضری پر اس کی خبر لیتے ہوئے کہا "دیکھو جی بیمار پرسی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم وہاں دھرنا ہی دے کر بیٹھ جاؤ۔ اگر تم کل پھر تمام دن غائب رہے تو میں اس خاتون سے کہہ دوں گا کہ یہ شخص تمہارے پاس ازراہ استمزاج نہیں آتا ہے بلکہ اپنی حماقت تاب محبت سے مغلوب ہو کر آتا ہے۔"

"ازیں چہ بہتر! یہ تو اچھی بات ہوئی کہ میرے جذبات محبت کی تم ترجمانی کردو مجھ سے تو شاید قیامت تک بھی اس خاتون کے آگے اظہار محبت نہ ہوگا۔ ارے میاں وہ تمہاری لیڈی ڈاکٹر پوچھ رہی تھی تم کو" اس نے یہ فقرہ بطور رشوت کے ادا کیا تاکہ میں اپنی چیرہ دستی سے باز آجاؤں۔

"کیا پوچھا تھا انھوں نے" میں نے اپنے سوال میں اشتیاق کی حرارت پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔

"پوچھنے لگیں کہ وہ نیم ہیرو صاحب نہیں آئے؟" اجمل نے ہنس کر کہا "نیم ہیرو؟" میں نے غصہ سے کہا "نیم ہیرو کہا تو انھوں نے مجھے پھر! اچھا میں نے تہیہ کر لیا کہ صبح بیمار خاتون کے مکان پر جا کر لیڈی صاحبہ سے اس توہین پر سخت باز پرس کروں گا۔

"مجھے لیڈی صاحبہ نے پوچھا تھا!" میں نے رات کو اپنے بستر پر پڑے پڑے کئی بار خیال کیا۔ مرد کس قدر جلد فریب توقع کھا جاتا ہے! آخر لیڈی صاحبہ کی اس "پرسش" میں کونسا ایسا سحر تھا کہ جس نے مجھے توقعات کے سراب میں لے جا کر پھنسا دیا" اور وہ نیم ہیرو؟" میں نے تمام اپنے مفتوحانہ خیالات کی نفی کرکے دل میں کہا "نیم ہیرو بھی تو کہا تھا انھوں نے مجھے۔ دیکھو کیسی خبر لیتا ہوں صبح ان کی" اپنی خیالات میں سو گیا۔

ناظرہ کی حسین تحریر اور رنگین عبارت سے اجمل محبت کے بخار میں مبتلا ہو چکا تھا یعنی وبائے عشق اس کو پہلے سے لگ چکی تھی لیکن اب حسن کی سوزکاریوں نے اس قدر مہلک اسباب پیدا کر دئے تھے کہ وہ ہلاک عشق ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بیمار خاتون کی دلفریب ادائیں، اس کی متشکرانہ نگاہیں اور اس کے خاموش کنایات جن کو اگر نطق کی قوت بخشدی جاتی تو وہ ایک

ایسا حشر جذبات، ایک ہنگامہ جراحت رسانی پیدا کر سکتے تھے کہ اچھی تمام عمر پھر آستانہ محبت سے سر نہ اٹھا سکتا تھا ع

حسن ہی کیا نہ و بالا جو نہ عالم کر دے!

صبح ہوتے ہی ہم نے جلد جلد ناشتہ کیا اور بیمار خاتون کے مکان پر پہنچے۔ لیڈی صاحبہ ابھی نہیں آئی تھیں۔ ہم نے بیمار خاتون کی مزاج پرسی کی جس کا جواب اس نے نہایت مہذبانہ طریقے پر دیا۔ اس کی ساحرانہ سیاہ آنکھیں اپنے اندر اعجاز سامری پنہاں رکھتی تھیں۔ اس کے دراز و سیاہ گیسو ایک گنہگار کے نامہ اعمال سے بھی زیادہ طویل و سیاہ تھے۔ اس کی آواز میں ایک رس تھا جس کو نقاہت نے کسی قدر دھیما کر دیا تھا۔

میں اس کے اخلاق کے متعلق صحیح رائے ظاہر کرنے سے معذور ہوں لیکن اگر بات چیت اور چند حرکات سے کسی کے اخلاق کے متعلق ایک قیاسی خاکہ قائم ہو سکتا ہے تو میں بھی اس کے پر غلو رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی ذات کے متعلق ایک بہت بلند رائے رکھتی تھی۔ ایسی رائے جس کا اظہار سادہ اردو میں لفظ "خود بینی" سے ہو سکتا ہے۔

ہمارے آنے کے چند منٹ بعد مسٹر یوسف نے مجھے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "آپ حیران ہوں گے کہ میں کون ہوں اور اس طرح آزاد زندگی کیوں گذارتا ہوں؟ اجازت دیجیے کہ میں آپ حضرات کی حیرانی رفع کر دوں۔ میں در اصل نو مسلم ہوں اور امرت سر میں وکالت کرتا ہوں میرا اسلامی نام محمد یوسف ہے۔ یہ میری لڑکی ہے اور فرسٹ ایر میں پڑھتی ہے۔"

"کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ نے اسلام کی کونسی خوبی سے متاثر ہو کر اس کو قبول کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"خوبی؟ آپ کا عجیب سوال ہے۔ اسلام تو ہمہ خوبی ہے" دین دار نومسلم نے کہا۔

"میرا مقصد یہ ہے کہ کیا آپ بھی اسلام کے متعلق کسی خاص عقیدہ کے موجد ہیں جیسا کہ آج کل چند بزعم خود غلط مسلم مفکر کر رہے ہیں"

میں کسی اعتقاد کا موجد تو نہیں ہوں۔ ہاں لیکن عقیدہ کے متعلق ایک نئے خیال کا مخترع ضرور ہوں۔ قرآن کی پیش کردہ تعلیم تو ہونی چاہیئے ہر مسلمان کے عقیدے میں داخل" اور باقی جتنی مذہبی موشگافیاں ہیں ان کو میں فلسفہ کی شق میں جگہ دیتا ہوں۔ مختلف اسلامی عقائد کے سیاق وسباق کے بحث میں مبتلا ہونے کے عوض میں ان کو فلسفہ کے شعبہ میں رکھ کر صرف مطالعہ کی چیز سمجھتا ہوں تاکہ عقیدہ کی۔ آپ اعتراض کریں گے کہ فلسفی کا کیا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا ہے؟ تو معاف فرمایئے میں عرض کروں گا کہ اس کے عقیدہ کی مثال ایسی ہے جیسی پودے کی۔ جب تک آپ اس کی آبیاری کرتے رہیں گے وہ سبز رہے گا۔ بند کر دیں گے تو خشک ہو جائیگا اسی طرح فلسفہ جب تک مواد استدلال وعلل موجود ہیں قائم ہے اور اگر مخالف ادلہ پیدا ہو گئے تو اس کا تار پود بکھر جاتا . . . . . . "

"مجھے آپ کے نظریہ سے ذرا اختلاف ہے" میں نے کہا۔

"ابا میں اس بحث میں مطلق دلچسپی محسوس نہیں کر رہی ہوں" بیمار خاتون نے کہا۔

"اچھا شیلا! ہم بھی اس کو ختم کرتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر اب تک نہیں آئی" یوسف صاحب نے کہا۔ ابھی یہ جملہ ان کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ لیڈی صاحبہ بکس در دست قرمزی ساڑھی باندھے ہوئے مسکراتی اند

داخل ہوئیں۔

" اللہ عمر دراز کرے"۔ ان کے جمال کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا ۔ انھوں نے ایک ایسی تیکھی چتون مجھ پر ڈالی کہ میں وہیں تحلیل ہوکر رہ گیا

" آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا"۔ میں نے خوشامدانہ کہا اور بڑھ کر ان کے ہاتھ میں سے دوا کا بکس لے لیا۔ چند منٹ بعد ہم پھر مثل سابق کمرہ میں سے نکالے گئے مرہم پٹی ہوئی اور پھر واپس اندر آ گئے۔

" کل کہاں غائب تھے مسٹر نیم ہیرو ؟"

لاحول ولا قوۃ! میں اس توہین کا انتقام لینے تو آج آیا تھا۔ بالکل بھول گیا۔ باز پرس سے قبل ہی لیڈی نے پھر ایک بار میری توہین کر دی۔ آخر میں نے غصہ سے کہا " دیکھیے جناب! آپ کئی بار میری اہانت کر چکی ہیں۔ مجھے نیم ہیرو کہنے کا آپ کو کیا حق ہے ؟"

" حق ؟" یہ لفظ لیڈی صاحبہ نے اس قدر شیریں لہجہ میں کہا اور اس کے بعد اس قدر شیریں نظر سے مجھے دیکھا کہ میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا شہد کے تالاب میں غوطے کھا رہا ہوں۔ آخر میں نے حلق پر ٹائی کی گرہ درست کر کے کہا ؎

نتواں چشید قند مکرر و زاں لباں

بتواں شنود تلخ مکرر شنودہ را

یوسف صاحب نے اس شعر سے بہت لطف حاصل کیا اور ہنس کر لیڈی صاحبہ سے بولے " آپ سمجھیں کیا اچھی بات کہہ گئے ہیں یہ حضرت؟"

" ہم نے اتنی فارسی نہیں پڑھی ہے " لیڈی صاحبہ نے جواب دیا۔

" اجازت ہو تو میں عرض کر دوں اس کا ترجمہ " شیلا بیمار خاتون نے

اس شعر سے حظ حاصل کر کے کہا۔
" رہنے دو اگر غلط ترجمہ کر دیا تو خواہ مخواہ اتنے آدمیوں کے آگے خفت اٹھانی پڑے گی" لیڈی صاحبہ نے جواب دیا۔ چند منٹ بعد میں نے جانے کے لئے پر تولے تو لیڈی صاحبہ نے کہا "آپ کو آخر اس قدر جلد بھاگنے کی جلدی کیوں رہتی ہے؟ کیا آپ یہاں کسی شئے میں دلچسپی محسوس نہیں کرتے؟"
" ان کو تو چند فرسودہ کتابوں اور تاریک گوشۂ تنہائی سے دلچسپی ہے" اجمل نے کہا۔
" اسی طرح آبارات دن کتابوں میں سر کھپایا کرتے ہیں" شیلا نے کہا۔
" اور آپ کے خاطر پسند مشاغل کیا ہیں؟" اجمل نے شیلا سے دریافت کیا
" کوئی خاص مشغلہ مرغوب نہیں ہے۔ ہر شئے میں دلچسپی لیتی ہوں" اس نے جواب دیا۔
" اچھا بھائی اب میں تو عدالت جاتا ہوں۔ ایک ہفتہ سے نہیں گیا ہوں۔ مقدمات خراب ہو رہے ہیں" یوسف صاحب نے کہا۔ اس کے بعد وہ ہمارا شکریہ ادا کر کے چل دیئے۔ اب ہم چاروں رہ گئے۔ میں نے چپکے سے اجمل کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن شیلا نے یہ چوری پکڑ لی۔ بولی" صاحب! چلے جایئے گا۔ ابھی کیا عجلت ہے۔ کھانے کا وقت قریب آ گیا ہے"
" غلط! آخر میں بھی تو کسی کا مہمان ہوں" میں نے کہا۔
" آپ کن لوگوں میں رہے ہیں؟" یوں جواب دیا جاتا ہے کسی کی مہربانا نہ درخواست کا" لیڈی صاحبہ نے فرمایا۔

"لیڈی صاحبہ! مسٹر ناظم بہت صاف گو اور بے تکلف انسان ہیں" اجمل نے کہا۔

"اس کے برعکس آپ تکلف مجسم ہیں" شیلا نے اجمل سے کہا۔

"مطلق نہیں" اجمل نے محبت کی نظروں سے شیلا کو دیکھ کر جواب دیا۔ لیڈی صاحبہ میری آزادگفتگو اور بے ریا اطوار سے بہت متاثر ہوئیں ہیں۔ انہوں نے ان کی نگاہ میں ایک ارفع جگہ حاصل کر لی تھی۔

"اجمل صاحب آپ کے مرغوب مشاغل کیا ہیں؟" شیلا نے اس کی پُر اشتیاق نظروں کا جواب دے کر پوچھا۔

"کسی خاتون کے کپڑوں کی آگ بجھانا" میں نے کہا۔ شیلا ہنس دی اور لیڈی صاحبہ نے بھی قہقہہ لگایا۔

"لیکن دوسروں کی آگ بجھا کر اپنے کو سپرد آتش کر دینا یہ بھی تو میرا مشغلہ ہے"

اس نے کہا۔

"ہاں اور پھر لیڈی ڈاکٹر کے لئے دوڑنا یہ میرا مشغلہ ہے" میں نے کہا

"غرض کسی طرح سے نیم ہیرو بننے کی کوشش کرنا یہ ہے دراصل آپ کا مشغلہ" لیڈی صاحبہ نے کہا۔

"اور نیم ہیرو بن جانے کے بعد بند گاڑی میں رومان پیدا کرنا کیا آپ اس کو میرا مشغلہ نہیں کہیں گی؟" میں نے کہا۔ اس تلمیح پر شیلا نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں نے اس کی حیران آنکھوں کو لیڈی صاحبہ کی جانب متوجہ کر دیا۔ جس سے وہ کسی قدر نچا گئیں۔

اجمل نے پھر شیلا کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ کر دریافت کیا

شیلاآپ رومان کو کس حد تک روحِ انسانی سے قریب سمجھتی ہیں۔
"اس حد تک جس حد تک گدھے کی آواز سے وحشت کا ہو جانا" میں نے پھر دخل در معقولات کر کے کہا:
"آپ بالکل غیر شاعر انسان ہیں۔ ناظم صاحب! شیلا نے کہا۔
"اچھا بتایئے آپ کو سب سے زیادہ کونسا شعر پسند ہے؟" لیڈی صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا۔
"آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ .... الخ" میں نے کہا۔
"اردو کا بتایئے" انھوں نے کہا۔

جو بکرے نے مارا ہو بکری کے سینگ
تو بکری بھی ماریگی بکرے کے سینگ

میں نے اردو کا شعر سنا کر کہا۔ سب ہنسنے لگے۔
جب ہم چلنے لگے تو شیلا نے شام کے کھانے کا اصرار کیا۔ غرض چھ بجے کے قریب شریک طعام ہونے کو پھر اس کے مکان پہ پہنچ گئے۔ مسٹر یوسف بھی موجود تھے میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ اپنی لڑکی کو پردے میں کیوں نہیں رکھتے؟ اس کا وہ کوئی جواب شافی نہ دے سکے۔ صرف یہ کہا کہ وہ شروع ہی سے (یعنی ان کے اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی سے) بے پردہ رہی ہے اب اس کا پردہ میں رکھنا فضول ہے۔ غرض یہ پر لطف صحبت ۱۰-۱۱ بجے تک قائم رہی جس میں لیڈی صاحبہ کی شوخ گفتاری، شیلا کی محبوبانہ اداکاری اور میاں اجمل کی ناز برداری نے مزید لطف کا اضافہ کر دیا تھا۔ بارہ بجے کے قریب ہم لوگ اٹھ کر چلے آئے تھے۔
لاہور آئے ہم کو بیس دن ہو گئے تھے۔ میں نے اجمل سے کئی بار وطن

چلنے کو کہا مگر یہ دل فروش انسان آج کل آج کل کرتا رہا۔ آخر تنگ آکر میں نے تہیہ کر لیا کہ وہ چلے یا نہ چلے میں تو صبح دہلی روانہ ہوتا ہوں۔ اپنے اس ارادہ سے جب میں نے اسے آگاہ کیا تو وہ پریشانی سے بولا "ناظم میرا مقصد یہ ہے کہ آج میں شیلاؔ سے جا کر اپنی محبت کا اظہار کر دوں"

"اجمل! میں تمہارے اس خیال کی مخالفت کرتا ہوں۔ اگر شیلاؔ کو تم سے محبت نہ ہوئی تو تم کو سخت صدمہ ہوگا۔ اس کے علاوہ محبت جیسی شے کا اگر دنیا میں وجود ہے تو وہ ظاہر کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ ضبط کئے رہنے کی چیز ہے۔ محبت وہی ہے جو طوفانِ تمنا سے خالی ہو۔

ہوائے وصل کسے می کند کہ بو الہوس است
دراں دلے کہ محبت بود تمنا نیست

اجملؔ نے میری نصیحت پر توجہ نہیں کی۔ بارہ بجے جب کہ مسٹر یوسف عدالت جا چکے تھے وہ غیر متوقع ان کے مکان پر جا دھمکا۔ اس کی اس اچانک مداخلت سے شیلاؔ پہلے تو متحیر ہوئی لیکن اس کے اپنے دل میں بھی تو اجمل کی پیدا کردہ خلش موجود تھی۔ جس نے اس کی حیرانی کو رفع کر دیا۔

"خیریت اجملؔ صاحب! اس وقت کیسے آ گئے؟" اس نے سادگی سے دریافت کیا۔

"میں تم سے ملنے آیا ہوں شیلاؔ" اس نے غیر مستقل لہجہ میں کہا

"مجھ سے ملنے؟" اس نے دل ربائی سے پوچھا۔

"ہاں میں کل دہلی جا رہا ہوں۔ خیال ہوا کہ تم سے بھی مل لوں۔ کیا یہ میری مداخلت تم کو ناگوار ہوئی؟"

"نہیں" شیلاؔ نے مختصر جواب دیا۔

"شیلا!" اجمل نے اس کو اشتیاقانہ دیکھتے ہوئے کہا۔ شیلا نے جواباً اپنی حسین آنکھیں اس کی جانب متوجہ کر دیں۔

"کیا تم کو میری اس جدائی کا رنج ہوگا" اس نے بیتابانہ دریافت کیا۔

"شاید!" اس نے دھیمے سے کہا۔ چند منٹ بعد پھر بولی "آپ اب پھر کب آئیں گے لاہور؟"

"اب کیا کروں گا آکر۔ اس بار تو اتفاقاً آگیا تھا" چند منٹ تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد شیلا نے مسکرا کر پوچھا "آپ نے اس وقت دھوپ میں آنے کی تکلیف کیوں کی؟"

"شیلا تم اس کو تکلیف سے تعبیر کرتی ہو۔ اگر تمہاری اصطلاح میں تکلیف ایسی ہی پر لطف شے کا نام ہے تو میں تمام عمر تمہاری اس عطا کردہ تکلیف میں مبتلا رہنے کو تیار ہوں" ناظر نے نہایت پرسوز لہجہ میں کہا اس کا خیال تھا کہ جو کچھ اس کو کہنا چاہیئے وہ کہہ چکا تھا۔ لیکن شیلا بانداز استغنا بیٹھی رہی۔ آخر اس نے پھر کہا۔

"خاتون! تم مجھے معاف کر دو گی........ مجھے آج اپنے غیر واضح جذبات کی صراحت کر دینی چاہیئے........ میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہارا حیات بخش خیال فردوسی لطافت کی طرح میری روح پر مسلط ہو گیا ہے........ اور تمہاری مفارقت کا تصور مجھے جہنمی صعوبتوں میں مبتلا کر رہا ہے........ آہ شیلا!"

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

اس کے بعد وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر گھٹنوں کے بل شیلا

کے پلنگ کی پٹی پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ شیلا نے اس سرور انگیز اعلان سے متاثر ہو کر اپنے گوشۂ رخسار کو اجمل کی پٹی پر رکھی ہوئی کپکپاتی انگلیوں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد کے پرشعریت اقدامات ایسے تھے جنھوں نے دو تشنۂ الفت روحوں میں لبوں کی مضراب سے "لطیف نغمات" کی روح پرور گونج پیدا کر دی۔

جب ناظر میرے پاس آیا تو اس کے عضو عضو سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ میں نے اس کی محبت کی کامیابی پر اس کو مبارکباد پیش کی اور دوسرے روز صبح دہلی چل دیئے یہاں آ کر اجمل کی وحشت دیدنی تھی۔ ناظرہ نے بذریعہ خطوط اس کے اندر عشق کی حرارت پیدا کر دی تھی۔ لیکن شیلا نے اپنے مسحر کن حسن سے حرارت کو اس درجہ تیز کر دیا تھا کہ حرارت و حرارت زدہ دونوں ایک ہی مادہ کے بنے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔

دوسرے ماہ سے میں اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ اگر اجمل کے سکون طلب جذبات کا کوئی مداوا حاصل نہ ہوا تو وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنی وحشت مزاجی سے حیات و موت میں کوئی حد فاصل نہ رہنے دے۔ کئی روز تک میں پریشان رہا۔ آخر اس کے سوا کوئی تدابیر ذہن میں نہ آئی کہ دونوں کے اتصال کی جلد از جلد کوشش کرنی چاہیئے ایک روز میں اجمل سے بولا "میاں اجمل! ذرا دل کو قوی رکھو۔ اس قدر ہراساں نہ ہو میں کل یوسف صاحب کے پاس شیلا کے متعلق تمہارا پیغام بھیجتا ہوں۔ لیکن عزیز آخری بار میری اس نصیحت کو پھر سن لو۔ اگر تم محبت کی نارابراہیمی میں ہمیشہ ہمیشہ جلتے رہنا چاہتے ہو تو شیلا کے خیال مواصلت کو دل سے جلاوطن کر دو۔ مگا قدرت محبت کا آخری باب ہے۔ ایسا باب جس میں ٹریجڈی ہے!!

یوسف صاحب کے جواب خط میں ناظر پندرہ دن تک انگاروں پر

لوٹتا رہا۔ خدا خدا کر کے سولھویں دن جواب آیا۔ قبل اس کے کہ میں اس کو کھول کر پڑھ سکتا ناظر نے حریصانہ اس کو میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا اور بکمال گرسنگی آنکھوں کی راہ سے اس کے مضمون کو نگلنا شروع کیا........ اس کے بعد خط کو سینے سے لگا کر کرسی پر گر پڑا۔

میں نے اس کے بے حس ہاتھوں میں سے خط لے کر پڑھا۔ یوسف صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ یعنی حسین شیلا کو دائمی طور پہ ناظر کے حوالے کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ چند منٹ بعد اجمل کو ہوش آ گیا تو دیوانہ وار اس نے کمرے میں رقص کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ اس کے پیر شل ہو گئے اور جسم پسینہ پسینہ!

"سمندر کے اندر پانی نہیں ہے بلکہ مسرت رقیق بھری ہوئی دریا شاد مانی کی لہریں مارتے ہوئے بہ رہے ہیں۔ پہاڑ ٹھوس انبساط بنے ہوئے زمین پر قائم ہیں" اس نے بکنا شروع کیا۔

اور یہ کھو کھلا فضائے مبرم بنا ہوا تمہاری کن پٹی کی طرف آرہا ہے" اور یہ چانٹا تمہاری بتیسی جھاڑ دینے کو بلند ہو چکا ہے" یہ کہہ کر میں نے اس کی خوب خبر لی۔ حتیٰ کہ اس کے حواس بجا ہو گئے۔

شام کو میں نے اجمل کے چچا سے مل کر (اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا) معاملہ طے کیا اول تو اس قدامت پسند بزرگ نے میرے انتخاب کی مخالفت کی لیکن جب میں نے ان کو تمام واقعات کی نزاکت سے آگاہ کیا تو وہ بھی رضا مند ہو گئے۔ قصہ مختصر تاریخ سعید مقرر ہوئی اور میاں اجمل دولھا بنے ہوئے ایک بار اور لاہور جا پہنچے اور ہم ان کے" بعد از چچا بزرگ" بنے ہوئے اپنے پرانے قلمی دوست" کے مکان پر جا دھمکے۔

شادی میں مراسم و تکلفات کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔ شرعی اصولوں پر نہایت خیر و خوبی سے ہوگئی۔ لیڈی صاحبہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے بھی اجمل اور شیلا کے اتصال پر اظہار مسرت فرمایا۔

نکاح کے دوسرے روز شام کے پانچ بجے کے قریب لیڈی صاحبہ کا ایک رقعہ ملا کہ وہ میرا چائے پر انتظار کر رہی ہیں "چائے پر انتظار؟" میں نے حیرت سے دل میں کہا۔ "میں چائے پیتا کب ہوں" آخر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس دعوت نامہ سے ایسا حواس باختہ ہوا کہ دو مختلف رنگ کی جرابیں پہن ڈالیں۔ جن کا خیال مجھے ان کے مکان پر پہنچنے کے بعد آیا۔ چنانچہ بیٹھتے ہی میں نے پیروں پر نظر پڑ جانے کے خوف سے پاؤں سکیڑ لیے اور سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ لیڈی صاحبہ میری مردانہ جھجک کے علاوہ اس نئی حرکت کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ مسکرا کر بولیں۔ "یہ آپ سکڑے سکڑائے کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے پیروں کو اور زیادہ چھپانے کی کوشش میں گھٹنوں کو بالکل دوہرا کر دیا۔

انھوں نے میرے گھٹنے کو انگلی سے چھوا اور بولیں "کیا آپ کے گھٹنے میں کچھ تکلیف ہے؟"

"نہیں تو ویسے ہی یوں بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ فکر نہ کیجیے" یہ کہہ کر میں نے انتہائی خمیدگی تک پیروں کو سکیڑ لیا۔

"ضرور کچھ بات ہے۔ دیکھنے دیجیے"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے نازک ہاتھوں سے میرے متلاشی پناہ پیروں کو کرسی کے نیچے سے گھسیٹ لینے کی سعی بیکار کرنے لگیں۔ مجھے ان کی اس "ریسرچ" پر رحم آگیا۔ چنانچہ ذرا خفت کے ساتھ کرسی کے نیچے سے پیر نکال لیے۔

"یہ کیا؟ انھوں نے میرے دو ننگے پیروں کی جانب دیکھتے ہوئے ہنسکر کہا۔
"وہی جس کو میں اب تک چھپانے کی کوشش کر رہا تھا" میں نے مردہ آواز میں کہا۔
"یہ کیا دیوانہ پن ہے آخر؟ انھوں نے اس قدر شوخی سے دریافت کیا۔
"آپ کا خیال آجانے کے بعد دیوانگی پیدا ہو جانا لازمی بات ہے" میں نے جواب دیا۔
"کیا آپ کو میرا خیال آجایا کرتا ہے" انھوں نے کسی قدر شرمسارانہ پوچھا

"نہیں آتی ہے انکی یاد تو مدت نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں"

میں نے یہ شعر پڑھنے کو پڑھ دیا۔ لیکن جلدی سے بولا "معاف کیجئے لیڈی صاحبہ یہ تو میں نے ویسے ہی بک دیا۔ یاد وادکچھ نہیں آتی ہے"!
"عجیب بے اصولی طبیعت رکھتے ہیں آپ" انھوں نے کہا۔
"اب جائیں گے" میں نے رومان پیدا ہو جانے کے خیال سے خوف کھاکر کہا
"کہاں؟" انھوں نے پوچھا۔
"گھر" میں نے بچوں کی طرح جواب دیا۔
"یہاں آپ کے کون چٹکیاں لے رہا ہے؟"
"اچھا چل دے" میں نے کھڑے ہو کر کہا۔
"یہ کیا وحشت ہے۔ بیٹھے۔ آپ کو کبھی انسانیت بھی آئیگی؟" انھوں نے میرے ہاتھ سے ٹوپی چھین لی۔ ان کی اس حرکت سے میں اور وحشت زدہ سا ہو گیا۔ گھبرا کر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جی میں آئی کہ ننگے سر ہی نکل جاؤں

لیکن لیڈی صاحبہ نے اٹھ کر گھنٹی لگا دی۔
"اچھا اب آپ کے اس رومان کا کیا حال ہے" یہ انھوں نے پھر کرسی لیتے ہوئے کہا۔
"وحشت!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیڈی صاحبہ نے ایک پرشرارت قہقہہ لگایا۔
"جاؤں گا" میں نے وحشیانہ نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔
"نہیں جا سکتے" انھوں نے "سکتے" کو کھینچتے ہوئے ترنم کے ساتھ کہا۔
"جائیں گے" میں نے رونے کے انداز میں لے کے ساتھ کہا۔
"یہ کیا حرکت ہے ناظم! بچوں کی طرح مچلے جا رہے ہو" انھوں نے ڈانٹتے ہوئے دیا سلائی کا بکس میرے رسید کر کے کہا۔
"اے وہ خاتون جس کا نام بھی مجھے آج تک معلوم نہیں۔ آخر میں کیوں نہ جاؤں آپ مجھے کیوں قید کر رہی ہیں؟" میں نے کہا۔ لیڈی صاحبہ میرے قریب آگئیں اور اپنے خوب صورت ہاتھوں سے میرے کوٹ کا کالر درست کر کے بولیں" ناظم! اب ذرا انسانیت کے جامہ میں آجاؤ میں تم سے ایک کام کی بات کہنا چاہتی ہوں"
"مگر میں جب تک اس طرح مقید ہوں جامۂ انسانیت میں نہیں آ سکتا" میں نے احتجاج کے طور پر کہا۔
"مقید تم نہیں ہو میں ہوں .... تمہارے ان وحشیانہ اوصاف کی اسیر"
"تو کیا تم مجھ پر عاشق ہو میری خاتون؟" میں نے دیوانوں کی طرح چیخ کر

پوچھا۔ ...."

"ہش شور نہ مچاؤ۔ آہستہ بولو۔ ہاں کیا بکنے لگے تھے تم؟ عاشق؟ کیا تم کو یہ بھی مغالطہ ہے کہ کوئی احمق لڑکی تم پر عاشق ہو سکتی ہے" انھوں نے شوخی سے کہا۔

"جانے دیجئے اگر آپ مجھ پر عاشق نہیں ہیں تو میں تو کچھ ایسا ہی سمجھا تھا" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیوں جی اگر میں کبھی ایسی حماقت کر بیٹھوں؟" لیڈی صاحبہ نے شرارت ریز تبسم سے پوچھا۔

"تو میں سب سے پہلے آپ کو آگرہ لے کر پہنچوں گا" میں نے جواب دیا۔

لیڈی صاحبہ چڑ گئیں اور تھک کر کرسی پر جا بیٹھیں۔ اب میں اٹھا اور ان کے قریب جا کر کہنے لگا۔ خاتون اگر تم فی الحقیقت مجھ پر عاشق ہو تو میں تم کو نوید سناتا ہوں کہ چند روز بعد تم ایک اچھی شاعرہ بن جاؤ گی لیکن کسی سے شادی نہ کر لینا۔ ورنہ تمہارا مستبد میاں تمام تمہارے لطیف احساسات کا خاتمہ کر ڈالے گا۔"

"بیٹھ جاؤ ناظم! میں تم سے سخت ناخوش ہوں" انھوں نے مجھے جھڑک کر کہا لیکن چند منٹ بعد غنچہ کی طرح مسکرا دیں اور بولیں "کیوں صاحب اگر میں .... تم .... تم اور ہم ایک ساتھ زندگی گذاریں؟"

"یعنی آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں بھی ڈاکٹری پڑھ کر آپ کے ساتھ پریکٹس کرنے لگوں؟ لیکن اس میں میرے پانچ سال بھی تو برباد ہو جائیں گے" میں نے کہا۔ انھوں نے دانت بھینچ کر میز پر رکھا ہوا البم میرے کھینچ مارا اور ہونٹ کاٹتی ہوئی بولیں "سادہ لوح انسان!"

"شکر ہے تصویر بچ گئی"۔ میں نے اٹھا کر پھر اس کو ان کی میز پر جا رکھا اس بار انھوں نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولیں "ناظم! تم کونسی مٹی کے بنے ہوئے ہو؟ کیا تم اپنے پسند کرنے والے کو داد کا مستحق بھی نہیں سمجھتے؟"

"خاتون! معاف کرنا میں تمہارے اگلے فقروں کا مطلب بڑی دیر میں سمجھا۔ اگر تمہارا مطلب اس "اگر تم ہم" فقرہ سے یہ تھا کہ ہم تم باہمی شادی کرلیں تو دیکھو اچھی لیڈی صاحبہ پہلے تم کو یہ کہنا پڑے گا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو، اس کے علاوہ یہ بھی وعدہ تم کو کرنا ہوگا کہ میری بیوی بن جانے کے بعد بھی تم محبوب بنے رہنے کی تمنا نہ کروگی" میں نے کہا۔

"کیا ناظم! تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟ — مطلق نہیں ہے؟

لیڈی صاحبہ نے شرم سارانہ پوچھا۔

"محبت! نہیں میں تم سے محبت نہیں کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"پھر کیا نفرت؟ انھوں نے دریافت کیا۔

"ہرگز نہیں! نفرت کیوں کرتا۔ میری جگہ اگر کوئی اور بیوقوف جذباتی انسان ہوتا تو وہ تم پر سو جان و دل سے فدا ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ میرے اندر محبوب بننے کی صلاحیت ہے۔ کوئی مجھ سے محبت کر سکتا ہے؟ انھوں نے دھیمے لہجہ میں کہا۔

"ہاں وہ شخص تم سے محبت کر سکتا ہے جو تخیلات و تصورات کا غلام ہو۔ محبت وہی لوگ کیا کرتے ہیں جنھوں نے رومان کو مذہبی عقیدہ کی طرح اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے"۔ میں نے کہا۔

"آہ تم کس قدر خشک انسان ہو۔ لیکن اس کے باوجود کتنے اچھے آدمی ہو۔ بے غرض صاف باطن، بے ریا اور بے تصنع ناظم کیا تم کسی کے اوصاف کے

پرستار بن جانے کے بھی روادار نہیں؟"

"خاتون کوئی کسی کے اوصاف کا پرستار کیوں ہو۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے ہر شخص کو انسانی اوصاف کا حامل ہونا چاہئے۔"

"ہائے پتھریلی نیچر کے انسان! کہاں جا کر اپنا سر پھوڑ لوں۔ تم تو ناظم... فرشتوں کی بستی میں پیدا ہوئے ہوتے۔ انسانوں میں کیوں جنم لیا تم نے اچھی کیا تم اجازت نہیں دو گے کہ میں ہمیشہ ہمیشہ تمہیں پوجتی رہوں؟"

"تم یہ قیمتی الفاظ ادا کر کے مجھے مغرور کئے دے رہی ہو۔ اس سے زیادہ ایک مرد کی کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ وہ چپ چاپ محبت کیا جا رہا ہو لیکن میری پرستار بن کر تم کو مجھ سے دور رہنا چاہئے ——— اور مجھ سے ہرگز ملنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے" میں نے کہا۔

لیڈی صاحبہ کی حسین آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ انھوں نے بھرائی آواز میں کہا "میں تم سے دور نہیں رہ سکتی، میں تم سے منافقانہ نہیں کہتی ہوں کہ تم سے محبت نہیں کروں گی۔ لیکن مجھے اپنے سے جدا مت کرو۔ نہیں ناظم مجھے مت ٹھکراؤ۔ میں عمر بھر تمہارے پیر دھو دھو کر پیوں گی" یہ کہہ کر ان کی ہچکی بندھ گئی۔

"اور میں تم کو اپنے سر کا تاج، اپنی زندگی کی قیمت اور اپنی حیات کا انمول رتن سمجھتا رہوں گا۔ لیکن اسی وقت جب کہ تم بہ حیثیت زوجہ اپنے فرائض کا مظاہرہ کرو گی۔ محترم خاتون! میاں بیوی لاکھ طالب و مطلوب بنے رہنے کا حیلہ کریں لیکن شادی کے بعد وہ ہرگز عاشق و معشوق بنے نہیں رہ سکتے ان دونوں کی زندگیوں کی جوڑنے اس وقت جان ہوتی ہے وہ باہمی اعتماد و ادائے فرض ہے اور بس ———!"

لیڈی صاحبہ سسکیوں کے طوفان کے درمیان بولیں "آہ! میرے کمبخت دل نے کس شخص سے رابطۂ الفت قائم کیا ہے وہ عرب کے ریگستان سے زیادہ خشک اور بنجر دل رکھتا ہے۔ آہ لیکن اس خشک ریگستان کے اندر کیسے کیسے شاداب نخلستان بھی ہیں جہاں میری روح ہمیشہ تازگی حاصل کرتی رہے گی۔ ناظم میں تمہاری ہوں اور تمہارے مذہبی طریقے پر تمہارے ساتھ عقد کرنے کو تیار ہوں" یہ کہہ کر لیڈی صاحبہ نے اپنے کو میرے آغوش میں دھکیل دیا۔ میں نے ان کو واپس کرسی پر لٹا دیا۔

دوسرے روز ہمارا بھی عقد ہو گیا۔

اس کے دوسرے روز اجمل اپنی چہیتی دلہن کو وداع کرا کر دہلی روانہ ہو گیا۔ اور اس کے ایک ہفتہ بعد میں بھی اپنی جوتیا (لیڈی ڈاکٹر جس کو میں رضیہ کہنے لگا تھا) کو معہ اپنے تمام ساز و سامان کے دہلی لے آیا اور اس نے اپنی پریکٹس یہاں آکر جاری کر دی۔

اجمل و شیلا عام دولھا دولہن کی طرح شادی کے چند ماہ نہایت محبت و مسرت سے بسر کرتے رہے۔ اجمل شیلا کا پرستار تھا اور وہ بھی اس کی محبت کا اعتراف کرتی تھی۔ غرض دونوں سال بھر تک محبت کے زود زوال خمار سے مخمور رہے۔ اس کے بعد تبدریج یہ نشہ اترنا شروع ہوا۔ شادی نہ ہوتی تو شاید تا دم واپسیں کیف محبت میں سرشار رہتے۔ لیکن بعد شادی اس محبت زدہ جوڑے پر فطرت کے ان مقرر کردہ اثرات نے اپنا قبضہ جمانا شروع کیا جو روز ازل سے انسان پر اندریں صورت مستولی ہوتے چلے آئے ہیں۔

جب محبت کے زود گسل جذبات ان طالب و مطلوب کو اس سطح پر لے آئے، جہاں کثرت مشاہدہ توافر دید اور اثرات یک جائی سے ہر محبوب سے

محبوب چیز بھی ایک عام شے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو ذرا ذرا سی بے عنوانیوں کا ایک دوسرے کی زندگی پر اثر ہونا شروع ہوا۔ وجہ عیاں ہے۔ دونوں کی باہمی توقعات کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ اگر اس کے اندر قرب و بعد میں ایک بھی کبیدگی کا بھوت آ کودتا تو دورسے نظر آنے لگتا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں بھی بہت جلد ایک دوسرے سے سیر ہو گئے اور تنوع پسندانہ ذہنیت نے جو ہر انسان کے اندر کارفرما ہے دونوں کی باہمی دلچسپیوں کو سلب کر لیا۔ اجمل محسوس کرنے لگا کہ سشیلا سے شادی کر کے اس سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی کی تلافی کی کوئی امکانی صورت نہ رہی ہو اور ادھر سشیلا کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اجمل سے محبت کر کے اس نے اپنے انتخاب کا غلط ترین مظاہرہ کیا ہے۔

محبت کی زندگی شادی کے بعد پُر مسرت گذرنی بہت مشکل ہے۔ کیونکہ دونوں اپنی بے محابانہ توقعات ہیں (بسلسلہ عشق) بے حد وسعت پیدا کر لیتے ہیں۔ شادی کے بعد اثرات یک جائی جو قاطع ذوق و سرگرمی محبت ہیں دونوں کو اس قدر حساس بنا دیتے ہیں کہ اگر توقعات کی بے پایاں وسعت میں ذرا بھی ناگوار واقعہ کی دراندازی ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے کے طرز عمل پر تنقید کرنے لگتا ہے۔ محبت کب اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ ناز و نیاز کا قانون ہی علیحدہ ہے۔ جس میں سپردگی و پاس فرائض کا کیا کام۔ محبت اگر فی الحقیقت کرنے کی کوئی شے ہے (بقول بعض حضرات محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے) تو اس کی ابتدا قبل از شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ بعد شادی کے زوجین محبت کیا کریں۔ یہ طریقہ کار بحد کامیاب ہے۔ اگرچہ میں اس کے لئے عرض کر چکا ہوں کہ میاں بیوی کے دلوں میں جو حس موجود رہتی ہے اس کا نام محبت نہیں ہے۔ بلکہ باہمی طور پر خیال آسائش اعتماد اور پاس فرائض

ہے۔ لیکن آخر وہ کیا شے ہے جو اس پاس فرائض وغیرہ کی محرک ہوتی ہے؟
افسوس میرے پاس اس جذبہ کے لئے کوئی لفظ نہیں اور میرا خیال ہے کہ اس کے لئے لفظ اب تک وضع بھی نہیں ہوا ہے۔ لیکن جب تک کوئی لفظ وضع نہ ہو آپ کو حق نہیں کہ اس کے لئے غلطی سے لفظ محبت ہی استعمال کرتے ہیں

ہماری سنئے! میری رضیہ نے قبل از شادی مجھ سے عاشقانہ نیاز کی توقع ہی نہیں باندھی تھی۔ وہ غریب محض بیوی بنے رہنے کے خیال کے ساتھ مجھ سے منسوب ہوئی تھی چنانچہ ہماری شادی کو ایک سال گذر جانے کے باوجود کوئی بات ایسی نہ گذری کہ جس سے ہمارے باہمی جذبات میں خانگی بے عنوانیوں کے باعث کوئی زہریلا اثر پڑا ہو۔ اپنی محدود امیدوں کے خلاف رضیہ نے مجھے فرض شناس اور اس کی قربانیوں کی قدر داعتراف کرنے والا شوہر پایا تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی وہ میرے مردانہ بازوؤں کو تمام دنیا کی وسعت سے زیادہ پر آسائش وراحت رساں محسوس کرنے لگی میں نے بھی اس کی زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ شعبہ پر اپنے فرائض کے سرگرم پاسباں بٹھا دئے تھے۔ جو مجھے اس کی ہر ضرورت، رنج، وراحت اور مسرت وشادمانی سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح سچے غمگسار کی مانند عوض و معاوضہ کے سلسلہ میں نہیں بلکہ محض اس خیال سے کہ مجھ کو راحت پہنچانے میں وہ تفریح محسوس کرتی ہے۔ اس نے اپنی قابل قدر زندگی کو میرے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کسی ضرورت کا اظہار اپنے نازک لبوں سے نہیں کیا اور میں نے خود بھی اس کو اس قسم کی زحمت نہیں دی۔ اس کی فطرت کے غائر مطالعہ کے بعد اس کی پسندیدہ وغیر پسندیدہ چیزیں میری نظر میں تھیں۔ اس کی روح پر میرا تسلط تھا اور وہ میری روح پر مسلط تھی۔ نتیجہ یہ

ایک تھی جو دو جسموں میں جلوہ گر تھی۔ من تو شدم تو من شدی!
ہم نے بعد شادی کے ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کی تھی۔۔۔
آہ میں پھر وہی لفظ محبت استعمال کر گیا۔ میری اس کم دانی کو معاف کیجئے
انسان ہونے کی حیثیت سے تنوع پسندی سے ہم دونوں خالی نہیں ہو سکتے
تھے۔ مگر ہم تنوع کی تلاش میں جاتے کہاں؟ یہاں تو دونوں ذاتیں متنوع
تھیں۔ یہاں تو نت نئے پیار تھے۔ روز ایک نئی اور مسخر کن ادا تھی ہر دن
ایک جدید خوبی کا انکشاف ہوتا رہتا تھا! انسان خوبیوں کے باب میں اپنے
پیدا کرنے والے سے کسی طرح کم نہیں ہے کیونکہ یہ بھی اسی دریا کا ایک
قطرہ ہے۔ خوبیاں مستلزم انسانیت ہیں اور انسانیت مرجع الوہیت!
"ناظر جلد سے آ کر ام تسر مل جاؤ"۔ ڈھائی سال کی مدت کے بعد انجم کو
ناظرہ کا ایک دن یہ تار موصول ہوا۔ اس عرصہ میں شیلا لڑ لڑا کر لاہور جا چکی تھی
آہ وہ بھولا بسرا تصور اپنے تمام مردہ اثرات کو چھیڑتا ہوا تیزی سے اس کے
دماغ میں پھر آ کودا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ ناظرہ کے خیال سے اس کی روح
میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، سرور سے اس کے واماندہ اعصاب میں تشنج خفی سا
محسوس ہونے لگا۔ شادی نے اور سرکش شیلا نے اس مدت میں جو اضمحلال
و تکدر اس کی طبیعت پر پیدا کر دیا تھا، اس فرحت بخش پیام نے اس کو مٹا دیا
بیوی محبوب ہو کر بھی اس صنم خیالی کی برابری نہیں کر سکتی ہے جو عاشق کے
حریم دل میں اپنا مسکن بنائے ہوئے ہو چند منٹ تک سر تھامے بیٹھے رہنے
کے بعد وہ ایک منام طائر کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ صندوقچہ کھولا اور اس میں
سے ہلکے گلابی لفافوں کا بنڈل نکال کر میز پر بکھیر دیا۔ پھر ایک ایک خط کو
پڑھنا شروع کیا۔ ایک ایک سطر سے اپنی محبت کو دل کی حرارت سے سینچ

پہنچ کر عشق کا پیکر رنگین بنانے لگا۔ اور اس کے حسین خد و خال کو تخیل کی... والہانہ مدد سے ایک ایسے "امتثالی خاکہ" سے سجانے لگا جو اس کے شکستہ تصور میں آج تک نہ آیا تھا۔ آہ محبوب اور بیوی میں کس قدر تفاوت ہے ــــ بعد المشرقین!

شیلا اپنے باپ کے پاس جا ہی چکی تھی۔ وہ پھر ایک بار اپنے تخیل کی وسعت کی ملکہ کے جان بخش تصور اور حیات پرور خط و کتابت کے لیے آزاد تھا۔ کاش ہر شے ہمیشہ اسی نہج پر اپنی فطرت قائم کر لیا کرے جس نہج پر ہمارا تخیل اس کا بت بنا لیا کرتا ہے۔ کاش ناظرہ سے اس کی شادی ہوئی ہوتی جو اس کی متاہل زندگی کو آسودہ کر دیتی کیوں نہیں کر سکتی تھی۔ کیا وہ اپنے خطوط میں شعریت ایک نغمۂ فردوسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا اجمل اس کو اپنے تصور میں کامل و مکمل عورت نہیں سمجھتا تھا؟

شیلا کس قدر تند خو عورت تھی۔ بات بات پر اس کے طرز عمل پر باز پرس کرنے کی عادی، ذرا ذرا سی حرکت پر محاسبہ کرنے کی خوگر۔ ناظرہ! تیری خط اور تیرا تصور میرے ناکارہ دل کے ساتھ صرف اس قدر احسان کر سکتا ہے کہ جب میں ہزیمت خوردہ سپاہی کی طرح شیلا کی دل آزاریوں سے تنگ آ کر کہیں نکل بھاگوں تو تو میری روح کی گہرائیوں سے نغمہ سکون بخش بلند کر کے مجھے آسودہ کر دیا کرے۔ یہ اجمل کے خیالات تھے۔

الغرض میاں اجمل اپنی مدت سے کھوئی ہوئی پچھلی دولت کی بازیافت پر بیحد مسرور تھے۔ فوراً امرت سر چل دیئے۔ مجھے جو معلوم ہوا کہ یہ بے وقوف انسان پھر اسی "خیالی عشق" کا شکار ہو کر امرت سر جا رہا ہے تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔ ہم تین روز تک امرت سر رہے لیکن ناظرہ اپنی مقررہ جگہ پر ہم کو نہیں

ملی۔ میں نے اجمل کو ہموار کیا اور اس کو لاہور لے کر پہنچا۔ یہاں شیلا ایک ہفتہ سے بخار میں مبتلا تھی۔ چنانچہ اس کے صحت یاب ہونے تک ہم کو یہاں قیام کرنا پڑا۔ آخر میں نے شیلا کو بھی سمجھا بجھا کر اجمل کے ساتھ دہلی چلنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ الغرض ہم تینوں پھر دہلی آ گئے۔

اس جدائی نے بھی دونوں کے جذبات نفرت کو اشتیاق ملاقات سے نہ بدلا تھا۔ اجمل کی شیفتگی طالب حقوق شوہر کی صورت اختیار کر چکی تھی اور شیلا اب بھی اس سے عاشقانہ نیاز کی توقعات باندھے ہوئے شان معشوقانہ کے ساتھ اس سے پیش آتی تھی۔

ایک روز اجمل کو پھر ناظرہ کا خط ملا جو دہلی سے ہی لکھا گیا تھا۔ اور جس میں مرقوم تھا کہ وہ بوجہ علالت مقررہ تاریخ کو اس موعود جگہ پر نہ آ سکی تھی اسکے بعد تحریر تھا کہ وہ بھی آج کل دہلی آئی ہوئی ہے۔ اگر وہ اب بھی اس سے ملاقات کا متمنی ہے تو یہاں کوئی جگہ مقرر کرے۔ اس خط نے پھر اس پر ناظرہ کی دھن سوار کر دی۔ پھر وہی خیال وہی محبت کی روئیت رنگین! اجمل و ناظرہ کی خط و کتابت پوسٹ ماسٹر کے توسط سے ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ناظرہ نے اپنے خط کا جواب بھی پوسٹ ماسٹر کی معرفت طلب کیا تھا۔

شیلا کی طبیعت دو روز سے خراب ہونے کی وجہ سے اجمل اس مکتوب کا جواب نہ دے سکا۔ آخر تیسرے روز روشن آرا باغ ملاقات کے لئے مقرر کر کے اس نے خط ڈال دیا۔ جواب دوسرے روز آ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن دو روز ناظرہ کی چٹھی نہ آئی۔ آخر بے تابانہ خود ہی ڈاک خانہ جا پہنچا ملازم کی واپسی کا بھی انتظار نہیں کیا۔

جب اس نے گورنمنٹ کی اس عمارت میں قدم رکھا تو ایک عورت (جس

کی اس کی جانب پشت تھی) کو پوسٹ ماسٹر سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی اپنے خط کے متعلق دریافت کرنے کو آگے بڑھا کہ پوسٹ ماسٹر جو اس کا شناسا تھا بولا"۔ ہلو مسٹر ناظر! اپنی چٹھی لے جاؤ" لفظ ناظر پر اس خاتون نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے مڑ کر کیا دیکھا دونوں پر بجلی گر گئی۔ اجمل بھوچکا سا ہو گیا۔ بمشکل یہ کہہ سکا "شیلا! شیلا تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اجمل! ــــــ اجمل.......... نا...... نا...... شیلا نے ہکلاتے ہوئے ادا کیا۔ اجمل نے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھا۔ اپنا لکھا ہوا لفافہ، جس پر ناظرہ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کرخت لہجہ میں دفعتاً کہا۔ "تم یہ حرکت کرتی ہو.......... میرے پرائیویٹ خطوط یہاں سے اڑا لے جاتی ہو؟ کیوں؟ شیلا کی نظر بھی اس لفافہ پر پڑی جو پوسٹ ماسٹر نے ابھی ابھی اس کو دیا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی حیرت و غصہ کے مخلوط جذبہ کے ماتحت کہا" لیکن اجمل.......... تم بھی تو میرے پرائیویٹ خطوط چرا لیتے ہو تم کو اس لفافہ پر قبضہ کرنے کا کیا حق ہے؟"

"تمہارے پرائیویٹ خط؟ کیا بکتی ہو" اجمل نے گرج کر کہا۔

"جنٹلمین! یہ پوسٹ آفس ہے۔ باہر جا کر لڑو" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔

اجمل شیلا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لایا۔ ردو قدح کے لئے بازار یا ڈاک خانہ جیسی جگہ موزوں نہ تھی۔ چنانچہ غصہ ضبط کرتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شیلا کو پوسٹ ماسٹر کے الفاظ پر حیرت ہو رہی تھی اجمل کو اس نے .... ناظر کہا تھا۔ ضرور کہا تھا۔

مکان پر پہنچ کر دونوں ایک دوسرے کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اس طرح ہال میں آئے گویا اب قالین پر پہنچتے ہی کشتی شروع ہو جائیگی۔

آخر اجمل نے دیوانوں کی طرح کوٹ اور ٹوپی ایک کرسی پر پھینک دی پھر میز پر زور سے مکا مار کر غصہ سے بولا" اب بتاؤ تم کب سے اس طرح ڈاک چرا رہی ہو"

"اجمل یہی میں بھی تم سے دریافت کرسکتی ہوں" شیلا نے کہا۔

"تم نے دوسری عورت کے نام کے خطوط کیوں پڑھے آخر؟" اس نے سخت لہجہ میں کہا" یہ خط ناظرہ کے نام کا ہے۔ تم کو اس سے کیا کام تھا۔

" اور تمہارے پاس جو خط ہے وہ بھی تمہارے نام کا کب ہے۔ ناظر کے نام کا ہے"

شیلا نے درشت لہجہ میں جواب دیا۔

"لیکن ناظر میں ہی ہوں۔ ادبی دنیا میں اسی نام سے معروف ہوں" اجمل نے کہا۔

"تو ناظرہ میں ہوں یہ میرا بھی قلمی نام ہے" شیلا نے کہا۔

اجمل نے حقارت سے ایک قہقہہ لگایا اور بولا" شیلا کیا تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے دم میں آجاؤں گا اور کسی غیر مرد سے خط و کتابت کرنے پر تم سے باز پرس کرنے سے باز رہ جاؤں گا"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تم بھی مجھ سے کوئی چکمہ چل سکتے ہو۔ تم اپنے کو ناظر ظاہر کرنے کا مجھے فریب دیتے ہو۔ ناظر ایک فقید المثال انسان ہے"

" اور ناظرہ بھی ایک بے مثل ہستی ہے۔ تم اس کی خاک پا کی برابر ہی نہیں ہوسکتیں" اجمل نے کہا۔

" اور تم ناظر کے مقابلہ میں ذرہ بے مقدار بھی نہیں ہو" شیلا نے جواب دیا۔ عجیب لطف تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی تعریف بھی کر رہے تھے اور برائی بھی۔

"شیلا! تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اچھا اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم ناظرہ ہو تو بتاؤ تم نے اس سے پیشتر کے خط میں کیا لکھا تھا؟" اجمل نے پوچھا۔

"تم بھی اگر ناظر ہو تو بتاؤ تم نے اگلے خط میں کیا تحریر کیا تھا؟"

"میں نے اپنی روح سے زیادہ عزیز ناظرہ کو ایک خط میں "پریم دیوی" لکھا تھا جس کا وہ مدتوں لطف لیتی رہی" اجمل نے کہا۔

"اور میں نے بھی اپنے ناظر کو ایک خط میں "سرو دش محبت" لکھا تھا جس پر وہ عرصہ تک وجد میں سر دھنتے رہے" شیلا نے جواب دیا۔

دونوں ایک ساتھ چونکے!

"ناظرہ! اجمل نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

"ناظر!" شیلا نے دھیمے سے کہا

"ارے! تم ہو ناظرہ! وہ ہستی جس سے میری دنیائے تخیل آباد ہے جو میرے خونچکاں دل کی جان ہے" اجمل نے کہا۔

"اور یہ تم ہو ناظر! میری روح کا پہلا فاتح"

"لیکن تم اس قدر بری کیوں ثابت ہوئیں؟" اجمل نے کہا۔

"اور تم اس قدر خراب کیسے ثابت ہوئے؟" شیلا نے پوچھا۔

"آہ ناظرہ! اپنے خطوط کے اندر تم کس قدر معصوم کیسی بھولی بھالی اور کتنی محبت پرور نظر آتی ہو۔ لیکن جسم میں اس کے بالکل برعکس روح رکھتی ہو!!"

"اور ناظر تم بھی اپنے مکاتیب میں کس قدر پاک ضمیر صاف باطن اور راست باز نظر آتے ہو۔ لیکن جسم میں اہرمن سے کم نہیں ہو۔ تم بجید

سخت گیر اور اکھڑ مزاج ہو" سشیلا نے کہا۔

"پرسوں ذرا سی بات پر میں نے ہی شیشہ چکنا چور کر دیا ہوگا۔" ناظر یا اجمل نے پوچھا۔

"اور اترسوں حلوے کی طشتری میں نے ہی صحن میں اٹھا کر پھینک دی ہوگی" ناظرہ یا شیلا نے پوچھا

"اچھا گذشتہ اتوار کو صرف بیل نہ ملنے پر ساڑی میں نے ہی جھبر جھبر کر دی ہوگی" اجمل نے کہا۔

"جی وہ گذشتہ سے پیوستہ ہفتہ تم کو ذرا سی چائے گر جانے پر قالین میں نے ہی چاقو سے کاٹ ڈالا ہوگا؟" سشیلا نے کہا۔

"لے دو میرا نام" میں نے دفعتاً نمودار ہو کر کہا۔ میرے پیچھے میری رضیہ بھی داخل ہوئی۔

"بے وقوف انسانوں" میں نے دونوں میاں بیوی کو ڈانٹتے ہوئے کہا" پرانے مردے کیوں اکھیڑ رہے ہو۔ تمہاری جنگ کبھی ختم ہوتی ہے"

"آہ ناظم! میں مرگیا اور میرے ساتھ وہ میرا ذہنی بت بھی فنا ہوگیا۔ آہ کاش ناظرہ تو تصورات کا جامہ پہنے ہوئے عالم بسیط ہی میں مصروف خرام رہتی۔ کاش تو منقید آب و گل نہ ہوتی۔ اف میری زندگی کا کچھ سہارا نہ رہا۔ ...... ناظرہ .... ناظرہ!" وہ دیوانوں کی طرح اپنے تخیل خاکے کے تعاقب میں دروازہ کی طرف دوڑا اور دروازہ سے ٹکرا کر گر گیا

اجمل! ہوش میں آؤ۔ سشیلا ذرا اپنے شوہر کو سنبھالو یہ وقت اکڑے رہنے کا نہیں ہے یہ کیا ستم ہے کہ خط و کتابت میں تو تم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار رہے اور میاں بیوی بن کر نفرت کرنے لگے"

سشیلا نے با دلِ ناخواستہ اٹھ کر اجمل کو اٹھایا۔ جب اس کے حواس درست ہو گئے، تو میں نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا "تم دونوں عملی دنیا میں زندگی گذارنے کے قابل نہیں ہو۔ تم کو تو کسی ایسی بستی میں لے جا کر چھوڑ دینا چاہیے جہاں دیوانے بستے ہوں۔ جذبات کے پتلو، وجدانات کے مجموعو! کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ فطرت نے دو مختلف زاویے قائم کر دئیے ہیں۔ Idealism (تصوریت) اور Realism (حقیقت)

تصوریت محض ایک سطحی شے ہے یہ صرف ہمارے جذبات و احساسات کو تازہ رکھتی ہے ہماری جوانی اور امنگوں کو زندگی بخشنا اسی کا کام ہے لیکن Realism (حقیقت) عملی زندگی کی ملکہ ہے۔ وہ ہم کو انسانیت کا درس دیتی ہے اور ہمارے فرائض سے آگاہ کرتی ہے جو لوگ...... Sentimen (وجدانی) بن جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوریت کو حقیقت پر غالب کر کے اپنا نصب العین اسی کو بنا لیتے ہیں یعنی حقیقت کی جگہ غیر حقیقت کو برتتے ہیں۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تیز چاقو سے اگر چمچہ کا کام لو گے تو تمہاری زبان ضرور کٹے گی اسی طرح اگر تم تصوریت کو اپنی عملی زندگی میں معتقدات کی جگہ دے لو گے تو اس کا حشر یہی ہو گا جو اسوقت تم دونوں کا ہوا ہے۔ محبت محض sentimental شے ہے۔ اس کو حقیقی زندگی کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اپنی حیات کا مقصد بنا لینا سخت غلطی ہے۔ بیوی کو بیوی کی طرح برتو! لیکن اس پر معشوق محبت کی دیوی اور صنم الفت یہ شاعرانہ مبالغہ صرف کر کے اس کو وہ نہ بنا دو جو فی الحقیقت وہ ہے نہیں۔ گرہست اور خانگی زندگی میں معاقدت عمل دکار کی مقتضی ہے۔ لیکن معشوق بنائی بیوی اس ماحول میں کیٹس کی بلبل کے سوا کچھ نہیں ہے

بیوی کو محبوب بنا لینے کے بعد تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس سے بچے جنوا کر اس کے گھر بار سپرد کر دو۔ اس کو معشوق بنا لینے کے بعد تم پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں جو شریعت عشاق کے لئے مقرر کر دی گئی ہیں۔ نیاز، افتادگی، خیالِ ناکامی، مفارقت اور غیر متناہی تصور مطلوب۔ کیا تم بیوی کے سامنے ان "خرافات" کو لے کر جا سکتے ہو؟ اور اگر جا سکتے ہو تو ایک خانگی زندگی بسر کرنے کی توقع کر سکتے ہو؟ ہرگز نہیں بیوی محبوب ہو سکتی ہے لیکن اس کا معشوق بن جانا خانگی زندگی کی تباہی کا باعث ہو۔"

"خدا کی قسم پیارے ناظم تم جو کچھ کہہ رہے ہو لفظ بلفظ صحیح ہے اب اپنی رضیہ کو دیکھو، اس نے تم کو شروع ہی سے شوہر سمجھا۔ عاشق خیال نہیں کیا۔ تم نے بھی اس کو بیوی سمجھا محبوب نہیں سمجھا۔ اپنی صحیح پوزیشن سمجھ کر تم نے خانگی زندگی اختیار کی۔ اب اگر محبت خود پیدا ہو جائے تو یہ بڑی برکت ہے (اور اچھے میاں بیوی کے درمیان ہو ہی جاتی ہے) اچھا ناظرہ! ہاں میں تم کو اسی نام سے پکارا کروں گا۔ کیا تم خانگی زندگی کو سنوارنے کی خاطر اپنے کو اتنا پست کر دینے کو تیار ہو کہ معشوق کے عوض بیوی بن جاؤ بولو ـــــ بولو میں بھی حقیقی شوہر بننے کی کوشش کرتا ہوں میری بیوی اب حساس وزود رنج شیلا نہیں ہے بلکہ پیاری ناظرہ ہے جس کو اب تصوریت کو خیرباد کہہ کر حقیقت کے جادہ میں قدم رکھنا ہے"

"اچھے ناظر! مجھ سے زیادہ تم وحدانی انسان ہو! تم قبل شادی (اور بعد میں بھی چند ماہ تک) اس قدر والہانہ طور سے میرے ساتھ پیش آتے رہے کہ میں سمجھی تم سے میں اسی طرح مستقلاً نیاز حاصل کرتی رہوں گی۔ لیکن بعد میں تم کرنے لگے میری توقع کے خلاف اکڑ فوں۔ شادی سے پہلے

ادھر تو تم نے مجھے محبوب بنا لیا اور پھر لگے بعد میں سینہ زوری کرنے۔ میں کب اپنی توقعات کا خون ہوتے دیکھنا پسند کر سکتی تھی۔ میں بھی سرکشی کرنے لگی۔ الحمد للہ بھائی ناظم نے آج ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم کو حقیقی طور پر میاں بیوی بننا بتا دیا۔ اب میں بھی تمہاری حقوق شناس بیوی ہوں۔ بشرطیکہ تم بھی نیک نفس شوہر بننے کا وعدہ"۔

"وعدہ؟ وعدہ کیسا! میں تو تمہاری آسائش کی خاطر اپنی جان پہ ہر طرح کی صعوبت لینے کو تیار ہوں" اجمل نے کہا۔

"اور میں بھی تم کو اپنا آقا سمجھ کر ہر وقت تمہارے ایثار کا احترام کیا کروں گی" شیلا نے کہا۔

"پاگل انسانوں! یہی تو محبت ہے" اس مکالمہ میں پہلی بار میری رضیہ نے حصہ لے کر کہا۔

"ہش رضیہ! خالی محبت نہیں 'محبت زوجین' کہو"۔ میں نے اسکی اصلاح خیال کر کے کہا۔

قیسی رام پوری

خوابوں کی بستی اور حقیقت کی دُنیا

"اری لے، اس تیرے چہیتے کا خط آج پھر آیا ہے"۔ بلقیس نے ڈولی میں سے اترتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے؟ اری دکھا تو سہی"۔ میں نے بے چین ہو کر کہا۔

"نظم تو جا ایسی بھی کیا بے چینی ہے۔ اس کا نام سنتے ہی لگا دم نکلنے"۔ بلقیس نے شرارت سے کہا۔

"اے ہے بھئی دیدو۔ یہاں تو چار دن سے جواب کی آس تک رہی ہیں"۔ میں نے کچھ جھینپ کر کہا۔

"کمرہ میں تو چل یا یہیں ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے پڑھے گی"۔ بلقیس نے دالان کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے کمرے میں اطمینان سے پڑھیں گے"۔ میں نے کہا۔

بلقیس نے دالان میں جا اماں بی کو سلام کیا اور بیٹھ گئی۔ اماں بی نے دعائیں دیں اور مجھے آواز دی۔ میں گئی تو انھوں نے کہا "تمھاری سہیلی آئی ہیں انھیں لیجا کر اپنے کمرے میں بٹھاؤ" میں بلقیس کو لے کر اپنے کمرے میں آئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی پھر میں نے وہی سوال کیا "کہاں ہے خط؟"

"میرے پاس ہے" اس نے نہایت طمانیت سے کہا۔

"اچھی تو کیا مجھے نہیں دکھاؤ گی" میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔

"دکھاؤں گی ضرور، مگر ایک شرط پر" اس نے کہا۔

"وہ شرط کیا ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم کوئی خط نہ لکھو گی" اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

"اوئی بی! میں نے تو ابھی پڑھا بھی نہیں کہ اس میں لکھا کیا ہے اور جو اس میں کوئی جواب طلب بات ہو تو؟ میں نے کہا۔

اس پر بلقیس نے ایک مستقل لکچر دے ڈالا۔

"حسنی ذرا سوچو تو سہی تم کس بکھیڑے میں الجھ رہی ہو۔ واقعات کیا ہیں؟ یہی نا کہ تم نے "ادیب" میں ثریا کے نام سے ایک مضمون لکھا۔ جس نے مقبولیت خاص و عام حاصل کی۔ ایک منچلے نے اڈیٹر ادیب کی معرفت اس مضمون کی تعریف کی ایک خط لکھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا مگر جہاں ہر انسان کی یہ کمزوری ہے کہ اپنی برائی سے ناراض اور تعریف سے خوش ہوتا ہے تمھاری انتہائی کمزوری اس طرح ظاہر ہوئی کہ تم نے اس توصیفی خط کا جواب لکھنے کی ٹھیرا دی میں نے اسی وقت تمھیں منع کیا تھا کہ ایک غیر مرد کے خط کا جواب دینا کوئی ضروری امر نہیں ہے مگر تم نے کہا

لاؤ ذرا ان حضرت کو بنائیں۔ ذرا سا مذاق ہی رہے گا۔" یوں اس مراسلت کی ابتدا مذاق سے ہوئی مگر اب میں دیکھتی ہوں کہ معاملہ سنجیدہ صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ شخص جس سے تمہاری خط وکتابت ہے کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ بحیثیت ادیب کے تمنائی کی صحافت اردو میں دھاک ہے، یہ بھی ضرور ہے کہ یہ نام فرضی ہے جبھی تو اڈیٹر ادیب نے میرے پوچھنے پر لکھا تھا کہ "دہلی کے رہنے والے ہیں اور اس نام سے مضامین لکھتے ہیں"

اس سے زیادہ خود انھیں معلوم نہیں کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں اچھا مضمون لکھا بھئی تم نے کہ بیٹھے بٹھائے اپنے ساتھ مجھے بھی اس مصیبت میں پھنسا دیا اڈیٹر ادیب ہیں کہ مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں کہ ثریا صاحبہ سے اور کوئی مضمون لکھوا کر بھیجئے ہر دوسرے تیسرے دن ایک خط بھیجدیتے ہیں۔ میں جواب دیتے دیتے تنگ آ گئی کہ مضمون کوئی آندھی کے آم تو ہیں نہیں۔ جب کوئی مضمون لکھا جائے گا آپ کو بھیجدیا جائے گا۔ اُدھر وہ تمنائی صاحب ہیں کہ تمھاری جان کو آ رہے ہیں۔ اور تم ہو کہ انھیں جواب دے دے کر اور شہ دے رہی ہو۔ ختم کرو اس علت کو یہ کیا روگ لگا یا ہے۔ اپنے پیچھے؟ کہیں ہنسی ہنسی میں پھنسی نہ ہو جائے۔ تم کہتی تو یہ ہو کہ تمنائی کو الو بنا رہی ہو مگر تمہارے خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ تمہیں لکھنا نہیں چاہیئے وہ لکھ رہی ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمھاری تحریروں سے کسی مغالطہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بھلا سوچو تو سہی ایک لڑکی کا اس طرح ایک اجنبی مرد سے سلسلہ مراسلت جاری رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اگر کسی کو جھوٹوں بھی معلوم ہو گیا تو ساری عمر کے لئے خدا نہ کرے کلنک کا ٹیکہ

لگ جائے گا۔ مجھ بندی کی بھی ناحق شامت آئے گی کہ ابھی سہیلی تھیں غیروں کے خط لا لا کر دیتی تھیں۔ اماں بی کے کان میں اگر اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو میرا چونڈا مونڈ ڈالیں گی۔ باز آئی بی میں ایسے بہناپے سے ان سب سے زیادہ یہ کہ اب تمہاری بات ٹھہری ہے اور عجب نہیں کہ مہینے سوا مہینے میں تمہاری شادی بھی ہو جائے۔ ایسی صورت میں تمہیں یہ خط و کتابت فوراً ختم کر دینی چاہیئے۔ جب تک تم مجھ سے وعدہ نہ کرو گی کہ ان واہیات باتوں کو جلد از جلد ختم نہ کر دو گی میں تمہیں کوئی خط وط نہ دوں گی۔"

میں نے کہا خدا کا شکر ہے کہ تم نے اپنی اسپیچ تو ختم کی۔ بہت بن چکیں مصلح بس اب وہ خط مجھے دکھاؤ۔"

"اری ذرا سمجھنے کی کوشش تو کر تو تو ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتی ہے۔ سارا رومان دھرا رہ جائے گا۔ مرد بڑے فریبی ہوتے ہیں چکنی چپڑی باتوں سے عورتوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ان کے تو کسی قول، وفعل کا اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ رہا خطوں کا معاملہ تو میرا یقین کر کہ خطوں سے زیادہ انسان کسی اور تحریر میں جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک طریقہ ہے اور مکتوب میں جو کچھ لکھا ہوا ہو اس پر یقین کر لینا بے وقوفی ہے" بلقیس نے کہا۔

"ہاں یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں اور مجھے اپنے آپ پر اتنا اعتماد بھی ہے کہ تمنائی خواہ کتنے ہی بڑے انشا پرداز کیوں نہ ہوں مجھے بہکانے میں کامیاب نہ ہوں گے۔" میں نے کہا "یہ تو محض ایک دلچسپ مشغلہ ہے آج ہے، کل نہ ہوگا کوئی ساری عمر کا ٹھیکہ تو میں نے لیا نہیں ہے۔ اتنا میں اور کہوں گی کہ تم نے تمنائی کی سیرت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے ان کے دو خط اس سے پہلے آ چکے ہیں، ان میں کوئی ایسی بات نہیں جسے خلاف تہذیب کہا

جائے۔ یا جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہو کہ ان کی نیت بخیر نہیں ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں تصنع کو بہت کم دخل ہے۔"

"بجا ارشاد ہوا۔" بلقیس نے کہا "تمہارے پاس تو وہ خطوط محفوظ ہوں گے نا لاؤ تو ذرا میں انھیں تمہارے ساتھ پڑھوں۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کتنے پانی میں ہیں۔"

"ابھی لاتی ہوں۔" کہہ کر میں اٹھی اور میز کی دراز کھول کر دونوں خط نکال لائی ــــ

"پہلا خط پڑھ کر سنا۔" بلقیس نے کہا۔

میں نے خط پڑھنا شروع کیا:۔

حیران ہوں کہ آپ کو کس طرح مخاطب کروں؟ الفاظ تخاطب کو اس باب میں معذور پاتا ہوں۔ آپ سے میں قطعاً ناواقف اس لئے رسمی الفاظ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ مبادا ناگوارِ خاطر گذریں۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ القاب وآداب کا فیصلہ خود آپ ہی پر چھوڑ دوں اور جو کچھ مجھے کہنا ہے کہنا شروع کر دوں انھیں میرے قلبی تاثرات سمجھئے۔

میں نے ایک نامعلوم خاتون کو خط لکھنے کی جسارت کیسے کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ادبِ لطیف میں آپ کا مضمون "ربابِ شکستہ" دیکھ کر مجھ سے یہ ظلم نہ ہو سکا کہ آپ کو اس کی داد نہ دوں۔ گو عوام کی نظر میں میرا یہ فعل مستحسن قرار نہ پائے گا تاہم اپنے ذوق کی اس فتنہ روشی کا کیا کروں کہ جب تک آپ کو یہ خط نہ لکھ لیا قلب کا اضطراب دور نہ ہوا۔ آپ کا جی چاہے تو اسے مذموم

حرکت سمجھ کر مجھے برا بھلا کہہ لیجئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میری بے اختیاری لائق تعزیر نہیں۔ بلکہ قابل رحم ہے۔

کہنے کو تو "رباب شکستہ" ایک مایوس محبت کی سرگذشت غم ہے مگر مجھ سے پوچھئے تو کہوں گا اس کا ہر نقطہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھ، ہر کشش ایک تڑپا دینے والی آہ اور ہر دائرہ ایک دھڑکتا ہوا دل ہے۔ میں نے بعض بعض فقروں پر گھنٹوں سر دھنا ہے۔ کئی دفعہ یہ محسوس کیا کہ میرے دل کا درد ثریا کے قلم سے ٹپکا ہے۔ کون ثریا؟ آسمان صحافت پر پہلی مرتبہ چمکنے والا ستارہ جس کی چمک دمک نے اور سب ستاروں کو مدہم کر دیا۔ جس کی تنویر نے دل و دماغ کی بر کتوں کو بیدار کر دیا۔ جس کی روشن کرنوں سے میرے دل کی ہر چیز جگمگا اٹھی۔

"رباب شکستہ" کو پڑھ کر مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک اجاڑ قبرستان ہے۔ جس میں ایک نئی قبر ہے۔ لوح مزار پہ "مرقد دل" کندہ ہے۔ شام کی اداسی میں ایک حسینہ سیاہ لباس پہنے رنجیدہ قدموں سے "مرقد دل" کے قریب آکر چراغ مزار روشن کر رہی ہے۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں پتہ دے رہی ہیں کہ آنسوؤں کے چشمے خشک ہو چکے ہیں۔ لبوں کا بدرنگ لاکھا پکار کے کہہ رہا ہے کہ اس خوب صورت سوگوار کو اسباب آرائش کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ کندھوں پہ بکھرے ہوئے سیاہ بال اور اترا ہوا زرد چہرہ دنیا سے بیزاری ظاہر

کہہ رہا ہے اور گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ جس سے زیب وزینت تھی جب وہ ہی نہیں رہا تو اب بناؤ سنگار کس کے لئے کیا جائے ؟

اس کو آپ "شاعری" نہ سمجھیں بلکہ آپ کے مضمون نے جو مجموعی اثر میرے دل پر کیا اس کی سچی تصویر ہے جسے میں نے اپنی تخیل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔

مجھے دریافت کرنے کا حق تو نہیں ہے تاہم کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے آیا وہ واردات ہیں یا تخیلات مجھے تو ان میں سے جیتے جی خون کی بو آتی ہے، اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے آپ کے زبردست تخیل کی داد دینے دیجئے۔

"ٹوٹے ہوئے تاروں کو مت چھیڑو۔ ان میں نغمہ کہاں ان کی جھنکار تمہیں پریشان کر دے گی۔ نغمہ سن کر جھوم جانے والے دوست! شکست نغمہ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ تم رباب کے تاروں سے کھیلتے رہے اور یوں پیدا ہونے والے ترنم میں کچھ ایسے کھوئے گئے کہ مضراب، ضرب در باب سب کچھ کھو بیٹھے یہاں تک کہ ایک ایک کر کے تم نے سارے تار توڑ دئے۔ پھر تم ان کی صدائے سمع خراش سے چونکے اور تم نے ایک حقارت کا قہقہہ لگا کر اس "رباب شکستہ" کو دور پھینک دیا اور دوسرا رباب اٹھا لیا۔ مگر تم نے وہ آخری جھنکار نہیں سنی جو یوں حقارت سے پھینکے جانے پر رباب سے بلند ہوئی اس میں سینکڑوں دکھی روحوں کی جگر پاش چیخیں تھیں، ہزاروں...

بیواؤں کے بین کا شور تھا۔ لاکھوں یتیموں کی دل خراش چیخ پکار تھی۔ کروڑوں مظلوموں کی دردناک آہ وزاری تھی۔ کیا اب بھی مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ "شکستِ نغمہ" کیا چیز ہوتی ہے؟"

مجھ سے نہ پوچھئے کہ اس کو پڑھنے کے بعد میری کیا حالت ہوگئی خدا بھلا کرے ملازم کا کہ وہ بے بلائے آگیا اسے دیکھ کر مجھے اپنی حالت سنبھالنی پڑی اور خواہ مخواہ اسے کوئی غیر ضروری کام بتانا پڑا۔ آپ نے دل کے خون میں ڈبو کر یہ فقرے لکھے ہیں ورنہ ان میں اتنی حرارت نہ ہوتی کہ پڑھنے والے کا دل اس کے قابو سے باہر ہو جائے۔ اس سے قبل کوئی مضمون آپ کا میری نظر سے نہیں گذرا۔ ثریا کا نام میرے لئے اب تک اجنبی تھا۔ اگر آپ نے پہلے کچھ بھی لکھا ہے تو مجھے مطلع کیجئے۔ میں بہت شوق سے اسے پڑھوں گا۔

مجھے آپ کے جواب کا بہت انتظار رہے گا۔ اڈیٹر ادیب کی معرفت مراسلت اگر کی جائے تو مناسب ہے کیونکہ میں اکثر دورے پر رہتا ہوں اور انھیں تبدیلی پتہ سے اطلاع دیتا رہتا ہوں۔

خاکسار

تمنائی

"اس قدر مبالغہ سے داد دینے کی ضرورت آخر کیا تھی؟" بلقیس نے ناک چڑھا کر کہا۔

"ارے بی! تم بھی حد کرتی ہو!" میں نے کہا "مبالغہ بھی تو ایک صنعت

ہے وہ شاعر ہیں، بھلا اسے کیسے چھوڑ دیتے ؟" اس پر ہم دونوں نے خوب قہقہے لگائے۔

"بلقیس!" میں نے کہا " اس سے تو تم بھی انکار نہیں کر سکتیں کہ یہ سلسلہ مراسلت ہے بڑا دلچسپ"۔

"کیوں نہیں!" بلقیس نے طنز سے کہا۔" دنیا میں صرف یہی ایک دلچسپ مشغلہ ہی تو رہ گیا ہے"۔

"اچھی تو ایمان سے گل کر بات نہ کیا کر" میں نے کچھ روٹھتے ہوئے کہا بھلا بتا تو سہی میرا اس میں بگڑتا کیا ہے ؟ انھیں یہ تک نہیں معلوم کہ میں ہوں کون اور میرا پتہ کیا ہے ؟ بہت سے بہت وہ یہ کر سکتے ہیں کہ تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو مجھے یقین ہے کہ تم انھیں کچھ بھی نہ بتاؤ گی یہ کوئی قانونی جرم نہیں ہے کہ وہ مجھ پر مقدمہ دائر کر دیں گے۔ تو نے کبھی سمجھا ہی نہیں کہ رومان کسے کہتے ہیں۔

یہ تیرے تن میں تو مردوں کی روح ہے"۔

"اے ہے تو رومان کیا اسی میں رہ گیا ہے کہ کوئی ایک مرد کسی عورت کی تعریف کرے اور پھر وہ عورت اس مرد کی جوابی تعریف کرے ؟" بلقیس نے کہا " سبحان اللہ کیا رومان ہے"۔

"اری دیکھتی جا۔ یہ تو ابتدا ہے"۔ میں نے کہا "کم بخت تجھے کیسے بتاؤں کہ یہ کیا چیز ہے"۔

"جی ہاں دیکھیے یہ آپ کی شعریت اور رومان پسندی آئندہ کیا رنگ لاتی ہے" بلقیس نے کہا۔

"اے ہے میں بھی تو کوئی ایسی ننھی بچی نہیں ہوں کہ کسی کے کہے سنے

میں آجاؤں" میں نے کہا۔
"پھر وہی بحث شروع ہوگئی" بلقیس نے کہا "ہاں وہ دوسرا خط تو سنا دیکھوں انھوں نے اور کیا کیا جھوٹ فرمایا ہے"۔
میں نے پہلا خط طے کر کے رکھا اور دوسرا اٹھا کر پڑھنا شروع کیا:۔

ثریا!

ابھی ابھی تمہارا خط آیا۔ میرے لئے بہت سی حیرانیاں اپنے ساتھ لایا۔ سب سے زیادہ تعجب خیز امر تو یہی ہے کہ "رباب شکستہ" بعض تمہارے تخیل کی تخلیق ہے میں تو سمجھا تھا کہ کسی کہنہ مشق ادیبہ نے ثریا کے فرضی نام سے اپنے نامراد عشق کی لفظی تصویر صفحہ قرطاس پر کھینچدی ہے۔ مگر مجھے کس قدر تعجب ہوا ہے یہ معلوم کر کے کہ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کی جنبش قلم نے "رباب شکستہ" کا حسین قالب اختیار کیا ہے۔ دوسری حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ پاکیزہ مضمون بقول تمہارے سب سے پہلا مضمون ہے، جب یہ نتیجہ ہے مشق اولین کا تو میں اپنی بہترین توقعات تمہاری آئندہ تحریروں سے وابستہ کر سکتا ہوں

ع اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

ثریا! تمہارے خط میں کئی نشتر ہیں جو میرے دل میں کھٹک رہے ہیں۔ میں نے القاب و آداب کی تلاش میں اپنا بہت سا وقت صرف کیا اور بالآخر ہار مان کر اس کا فیصلہ تم پہ چھوڑ دیا تھا۔ تم نے کتنی آسانی اور کس خوبی سے فیصلہ کر دیا:۔
ان کی تو سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ جہاں تکلف و مغائرت

ہو وہاں ان کی تلاش رہتی ہے۔ آپ مجھے صرف ثریا لکھا کیجیے! دوسرے یہ کہ اگر بجائے "آپ" کے اگر "مخاطب" تم سے کیا جائے تو وہ اجنبیت بھی نہ رہے گی جو اس بوڑھے لفظ سے ٹپکتی ہے" بوڑھا میں نے اس لئے کہا کہ اس لفظ سے خواہ مخواہ بزرگی کا مفہوم وابستہ ہو گیا ہے "

"آپ کی تصریح اس سے بہتر ناممکن ہے۔ میں اپنے حق میں بھی تم سے اس لفظ سے اجتناب چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں ابھی اس قدر بزرگ نہیں ہوا ہوں کہ یہ سزا میرے لئے تجویز کی جائے۔

تم میرے حالات سے آگاہ ہی چاہتی ہو۔ مختصراً یوں سمجھو کہ سات سال سے گورنمنٹ سروس میں ہوں۔ شہرت کی کبھی تمنا نہ ہوئی۔ اسی لئے "تمنائی" کے قلمی نام سے کبھی کبھی کچھ لکھتا لکھاتا رہتا ہوں۔ تم نے میرے مضامین دیکھے ہیں اور ان کی بیحد تعریف کی ہے۔ اتنی کہ میرا دماغ خراب ہو جائے اور میں اپنے آپ کو مافوق الانسان سمجھنے لگوں۔ فطرتاً تخیل پرست ہوں۔ اسی لئے مضمون نگاری کا شوق ہے۔ فنون لطیفہ سے مجھے دلچسپی ہے۔ شعر سے میری طبیعت کو مناسبت خاص ہے مگر شعر بہت کم کہتا ہوں کیونکہ ہماری شاعری میں اچھا شعر کہنے کی بہت کم گنجائش ہے۔ اساتذۂ قدیم نے کوئی بات نہیں چھوڑی۔ نثر میں ابھی نئی نئی طرزیں رائج کرنے کے لئے وسیع میدان پڑا ہے۔ اسی وجہ سے نظم چھوڑ کر نثر کی زیادہ توجہ کرتا ہوں۔ اکثر نقادوں کا خیال وہی ہے جو تم نے ظاہر کیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ زیادہ الفاظ میں کم باتیں کہتے ہیں

اور کم الفاظ میں زیادہ باتیں۔ تمھاری یہی وہ خصوصیت ہے جس
پہ مجھے رشک آتا ہے۔ تمہارے ذیل کے فقرے کو میں اپنی ادبی
کاوشوں کی بہترین داد سمجھتا ہوں اور نازاں ہوں تحسین سخن شناس
ہونے کی حیثیت سے میں اسے باعث فخر قرار دیتا ہوں:

"آپ ایک ایسے اسلوب بیان کے مالک ہیں جس
میں نظم و نثر کی سرحدیں مل گئی ہیں۔ شاعری کو پیغمبری
کا جزو کہا جاتا ہے۔ میں آپکی دلکش نثر کو اس لحاظ
سے پیغمبری کہہ دوں تو بیجا نہ ہوگا۔ اگر اس صدائے
حق پہ مجھے آپ کا فرد گنہگار ٹھیرائیں تو میرا قصور
معاف نہ کریں کیونکہ مجھے اپنی گنہگاری میں مزا
آرہا ہے"

کاش اس ادبی کافرہ کی طرز میں میں دو فقرے ہی لکھ سکتا۔
ثریا! تم نے لکھا ہے کہ تم شاعرانہ زندگی بسر کرتی ہو مجھے یہ سن کر
بہت خوشی ہوئی تخیل پرست عموماً بہت سی برائیوں سے بچے
رہتے ہیں۔ تمہاری تحریر میں ایک خاص قسم کی پاکیزگی ہوتی ہے
جس سے روح کی آلائشیں پاک ہوجاتی ہیں میرا دل تمہاری طرف
کھنچا جاتا ہے ....

حالانکہ میں نے عورتوں سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور تمھیں
یہ سن کر شاید خوشی ہوگی کہ میں عورتوں سے نفرت کرنے والا مشہور
ہوں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے وجود نے میرے دل
کی دنیا ہی بدل دی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ خدانخواستہ

میں شائستگی کی حدود سے گذرنا چاہتا ہوں خدا جانتا ہے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔ میری خیال پرست روح کو ایک مکمل عورت کی تلاش تھی۔ خدا کا شکر ہے میں نے تمہیں پالیا اور میری یہ دیرینہ آرزو بر آئی۔ مجھے زندہ رکھنے کے لئے صرف یہی خیال کافی ہے کہ اس دنیا میں کم از کم ایک وجود ایسا ہے جس کو میں اپنا معبود خیال سمجھتا ہوں۔ پہلے تمہارے مضمون نے اور پھر تمہارے خط نے مجھے ہمیشہ کے لئے تمہارا پرستار بنا دیا ہے۔ کیا میں توقع رکھ سکتا ہوں کہ آئندہ بھی تمہاری سرفرازیاں جاری رہیں گی؟

تمہارا

تمنائی

"وہی بیجا تعریف اور شاعرانہ تعلیاں۔" بلقیس نے کہا "بھلا کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ تم خدائی فوجدار کون؟"

"اری رہنے دے ان باتوں کو۔ کیوں کسی کا صبر سمیٹتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "لا اب تو وہ خط دیدے۔"

بلقیس نے اپنے اٹیچی کیس میں سے گلابی رنگ کا ایک سر بند لفافہ نکال کر دیا۔ میرے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ دل کی دھڑکن ہاتھوں میں آ گئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

ثریا!

تم نے تو اب کے اپنے خط میں سوالات کی بھرمار کر دی۔ ایک سوال تو اسقدر مبہم تھا کہ میں چونک سا گیا۔ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں

کی؟ دو لفظوں میں جواب یہ ہے کہ چونکہ اب تک میں تم سے نہیں ملا تھا اور اب جب کہ تم سے مجھے ذہنی اتصال نصیب ہو گیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان مادی تعلقات کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ میرا واسطہ اب تک خدا جھوٹ نہ بلائے تو سینکڑوں عورتوں سے پڑ چکا ہے مگر نہیں جانتا کہ ان میں سے ایک نے بھی میرے قلب پر اپنی محبت کے نقوش کیوں مرتسم نہیں کئے۔ عورت کی فطرت کا ہر پہلو میری نظر کے سامنے ہے شاید یہی وجہ ہو کہ وہ عورتیں میرے دل میں محبت کی گرمی پیدا نہ کر سکیں۔ جن سے مجھے واسطہ پڑ چکا ہے۔ تخیل کی دنیا میں میں عورت کو لائق پرستش مخلوق سمجھتا ہوں۔ مگر دنیائے عمل میں اس خوب صورت مخلوق کو میں نے سدا دلکش آزار پایا اس کی لطافتیں صرف دور ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور جب قریب سے اُسے دیکھا جائے تو اس کی تمام شعریت کا خون ہو جاتا ہے۔ جن مردوں کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں وہ شادی کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔ اور جو متاہل زندگی گذار رہے ہیں وہ اکثر گھریلو زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں میں نے اس وجہ سے یہ کلیہ قائم کیا ہے کہ عورت محض تخیل کی آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے۔ تیس سال سے میں عورت اور دنیا کو بغور دیکھ رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے ایک ایسی عورت مل جائے جو میرے مقررہ معیار پر پوری اترے مگر اب تک (سوائے تمہارے) مجھے کوئی ایسی عورت نظر نہ آئی۔ میں نے بیشمار مردوں کو کہتے

سنا کہ عورت کی فطرت ایک ایسا معمہ ہے جس کو مرد حل نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرد عورت کی فطرت کو سمجھ ہی نہیں سکتا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ عورت خود اپنی فطرت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مرد بالعموم سیدھے سادے ہوتے ہیں اور صرف اس وقت دھوکہ و فریب سے کام لیتے ہیں جب کہ وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ عورتیں ہمہ تن دھوکہ اور سراپا فریب ہوتی ہیں اپنی شکل و صورت میں وضع قطع میں بات چیت میں روز مرہ کی زندگی میں محبت میں یہاں تک کہ ان کی روح بھی فریب سے رچی ہوئی ہے۔ ان کی آخری تمنا شادی ہے جس پر انکی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے جس کو انھوں نے اپنا منتہائے زندگی قرار دے رکھا ہے یہ بھی ایک فریب ہے جس میں شرع کا وسیلہ ڈھونڈا جاتا ہے اور جسے مرد کی غلامی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (تم اس کلیہ کی استثنا ہو) میں نے شادی کرنے والی عورتوں کی چند اقسام مقرر کی ہیں۔

پہلی قسم ان عورتوں کی ہے جو شادی محض اس لئے کر لیتی ہیں کہ اپنی سہیلیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیں اور یہ سمجھی جائیں کہ شادی کے بعد وہ کچھ اور ہی ہوگئی ہیں اور واجب التعظیم ہیں۔ اس قسم کی لڑکیوں کو شادی کی خواہش یوں اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ اس سے انھیں آزادی زیادہ مل جاتی ہے۔ اور بڑی بوڑھیوں کی روک ٹوک ان پر کم ہوجاتی ہے۔ اس طرح انھیں موقع مل جاتا ہے کہ بیاہ کی آڑ میں کھل کھیلیں۔ دوشیزگی

کے زمانہ میں ان پر جو قیود اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں شادی کے بعد اٹھ جاتی ہیں اور اپنی آرزوئیں پورا کرنے کا انھیں زیادہ موقع مل جاتا ہے۔

دوسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو شادی کی اس لئے خواہش مند ہوتی ہیں کہ ان کو ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک بچہ سالانہ کی آرزومند ہوتی ہیں ان عورتوں کو اس بات کا مطلق خیال نہیں ہوتا کہ کس مرتبے کے شخص سے شادی کریں کیسی شکل و صورت ہو کیسی سیرت ہو کیا عمر ہو۔ ان باتوں سے انھیں کوئی غرض نہیں صرف مرد ہو اور بس۔

تیسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو شادی کا کاروبار کی ایک قسم قرار دیتی ہیں بچپن ہی سے ان کی تربیت اسی اصول کے ماتحت کی جاتی ہے۔ حصول دولت اور عیش و آرام ان کا مطمح نظر ہوتا ہے اس کی انھیں پرواہ نہیں ہوتی کہ بچے کس حال میں ہیں، بچے ہوں یا نہ ہوں اگر بے اولادی ہیں تو کوئی حرج نہیں اور اگر ڈیڑھ درجن بچے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر روپیہ پیسہ کافی ہے تو انھیں سب کچھ حاصل ہے۔

چوتھی قسم ان عورتوں کی ہے جو دوشیزگی ہی میں بدنام و رسوا ہو جاتی ہیں۔ انھیں شوہر کی تلاش اس لئے ہوتی ہے کہ ان کا دامن عصمت داغ بدنامی سے پاک ہو جائے۔ کھوئی ہوئی وقعت پھر انھیں کسی حد تک حاصل ہو جائے اس قسم کی عورتیں شادی اس لئے کرتی ہیں کہ وہ شادی کرنے پر مجبور ہیں اور سوسائٹی

میں منہ دکھانے کے لیے اور کوئی چارہ کار ہی انھیں نظر نہیں آتا۔
پانچویں قسم کی عورتیں وہ ہیں جو شادی کو مہذب عیاشی سمجھتی ہیں
ان عورتوں کو کسی ایک مرد کے ساتھ ساری زندگی گذارنا عیب
نظر آتا ہے۔ ذرا میاں سے بگڑی اور انھوں نے جھٹ طلاق
لے لی اور نکاح کر لیا۔ اس کو بھی چھوڑا اور کسی سے بیاہ رچایا۔
غرض انھیں شادیاں کرنے کا شوق ہوتا ہے اور جتنی شادیاں
چاہتی ہیں کر لیتی ہیں۔
میں کہاں تک ان شادی کرنے والی عورتوں کی قسمیں گناؤں
تم سنتے سنتے تھک جاؤ گی۔ مختصر یوں سمجھو کہ سانپ اور عورتوں
کی قسموں کا شمار ناممکن ہے ایسی صورت میں ایک سمجھ دار مرد کے
لیے شادی کا سوال مشکل ترین مسئلہ بن جاتا ہے جو قسمیں میں نے
اوپر بیان کی ہیں وہ اس قدر عام اور سرسری ہیں کہ ہر وہ شخص جس میں
ذرہ برابر بھی عقل ہوگی ان سے اجتناب کرے گا۔
مجھے گاؤں کی دوشیزہ بھی ناپسند ہے۔ معصوم دبے لوٹ وہ ضرور
ہوتی ہے مگر بے زبان پالتو جانوروں کی طرح۔ مجھے ایک عورت
کی ضرورت ہے۔ ایک ساتھی کی گھر والی کی نہیں۔ مشین کی طرح
حرکت کرنے والی عورت کو میں صنف نازک کی توہین سمجھتا ہوں
یہ ہیں شادی کی مشکلات اور جب میں ان پر غور کرتا ہوں تو میرا
دل متنفر ہو جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اتنے عرصہ تک جو میں
نے صبر کیا ہے اس کا اجر مجھے ثریا کی صورت میں مل گیا۔
تم نے اپنی تازہ ترین نظم مجھے بھیجی۔ شکریہ! اس پر میرے

خیالات معلوم کرنا چاہتی ہو تو سنو۔ تم میں شعر کہنے کا ملکہ نہیں ہے
اس لئے مناسب ہوگا کہ تم اپنی تمام تر توجہ صرف نثر کی طرف
رکھو۔ نثر میں تمہارا مرتبہ میرے نزدیک اتنا ہی بلند ہے جس
قدر کہ نظم میں پست۔ اس سے تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیئے
بہت کم لوگ ایسے ہیں جو عمدہ شعر کہنے پر قادر ہوں یوں سیکڑوں
شاعر پڑے پھرتے ہیں جن کو میں تو تک بند بھانڈ کہتا ہوں
تم کو تو شعر یوں بھی نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ تم خود سراپا شعر ہو۔

تمہارا

تمنائی

بلقیس نے کہا چلو اس خط کو پڑھ کر یہ اطمینان تو ہوا کہ وہ تمہیں شادی
کی دھمکی نہیں دیں گے۔ شکر ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح رومانی دیوانے ہیں
اور محض تخیل پرستی ہی کو اپنا مقصد حیات سمجھے بیٹھے ہیں۔ مجھے تو تم دونوں
کے مجنونانہ نظریوں پر ہنسی آتی ہے فطرت کے مقررہ اصولوں سے اگر بغاوت
کرنی ممکن ہوتی تو دنیا کبھی کی مٹ چکی ہوتی۔ یہ چونچلے صرف اسی وقت
تک کے ہیں جب تک کہ تمہاری شادی نہیں ہوجاتی اور تمنائی کو ان کے
خودساختہ نظریے توڑنے والی عورت نہیں مل جاتی"۔

"ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر جب تک میری شادی ہو یا تمنائی کو کوئی
شکست دینے والی عورت ملے کم ازکم اس وقت تک تو مجھے رومان کے ان
سہانے خوابوں کا لطف اٹھا لینے دو۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ شادی کی سنہری
زنجیروں میں مجھے دیر سویر جکڑ دیا جائے گا اور اسی لئے میں اس عہد زریں
کا بہترین مصرف چاہتی ہوں اور میرے لئے وہ یہی ہو سکتا ہے کہ تمنائی

سے سلسلۂ مراسلت قائم رہے۔ اچھی بلقیس وعدہ کرو مجھ سے کہ میری اسیری تک تم میرا ساتھ دو گی "

میں نے کچھ اس قدر سوز کر کہا کہ بلقیس کو میری حالت پر رحم آگیا۔ مگر میرا منہ دیکھ کر مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئی " روئے دیتی ہے مردی " اس نے زور کی چٹکی لے کر کہا، اور پھر ہنسنے لگی دن بھر میرا مذاق اڑاتی رہی۔ ہر بات میں رومان اور تخیل پرستی کو کھینچ تان کر لے آتی۔ یہاں تک کہ میں روہنکی سی ہو گئی۔ سالن میں نمک زیادہ تھا تو کہنے لگی " اس میں کچھ رومان زیادہ ہو گیا ہے کہیں تمہاری بی کہ بّا بھی تو تخیل پرستی میں مبتلا نہیں رہتیں ؟ پان جو اس نے کھایا تو اس کا منہ پھٹ گیا۔ کہنے لگی " مردار تو نے اس میں رومان تیز کر دیا۔ میرے منہ کے ٹکڑے اڑا دئے اس موئے رومان سے شربت میں برف زیادہ پڑ گئی تو مجھے کہنے لگی " اری اس میں اتنا سارا رومان کیوں ڈال دیا ؟ " غرض کچھ ایسی رٹ لگائی رومان کی کہ مجھے اس لفظ سے نفرت سی ہونے لگی۔ شام ہوتے وہ خیر سے گھر سدھاری جب جا کر کہیں میرا پیچھا چھٹا۔

ہر ہفتے " تمنائی " کا ایک خط آتا تھا۔ . . . . . . اور میں جواب لکھدیا کرتی تھی۔ ان کے خطوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا دل ان کی طرف کھچا جا رہا تھا اور انتظار کے سات دن گذارنے اجیرن ہو جاتے تھے۔ میں خود اپنی اس وارفتگی پر ہنستی تھی کہ یہ آخر مجھے کیا ہو گیا۔ غور کرتی تھی تو واقعات حد درجہ مضحکہ خیز نظر آتے تھے۔ بھلا ان سے میرا واسطہ کیا۔ ہزار چاہتی تھی کہ اس اجنبی سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع کر لوں اور لاکھ تہیہ کرتی تھی کہ اب کے خط آئے گا تو اس کا جواب نہ دوں گی مگر میرا دل مجھ سے بغاوت کرتا تھا

ادہر ان کا خط آیا اور میں جواب لکھنے بیٹھ گئی۔ میں انھیں لکھدینا چاہتی تھی کہ یہ خط میرا آخری خط ہوگا مگر بے اختیاری کا یہ عالم تھا کہ حرف مدعا زبانِ قلم پر نہ آتا تھا۔ دل کے ہاتھوں اس سے زیادہ مجبوری اور کیا ہوگی؟ تنہائی کے خطوط نے رومان کی اتنی فضا پیدا کر دی تھی کہ مجھے سوائے رنگینی کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ میری یہ حالت تھی کہ اس سنہرے دھندلکے میں بھٹکتی چلی جا رہی تھی۔

میری شادی کی گفت وشنید تو ہو رہی تھی اور بلقیس کی زبانی ساری باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ کئی جگہ سے بات آئی ہوئی تھی میرے والدین پرانے خیال کے نہیں تھے اس لئے مجھے ایف۔ اے تک زنانہ کالج لاہور میں تعلیم دلائی تھی۔ دوران تعلیم میں میری صحت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اور طبیبوں نے مشورہ دیا کہ پڑھنا لکھنا قطعاً چھوڑ دیا جائے چنانچہ کچھ ادپر ایک سال سے میں گھر ہی پر تھی۔ علاج باقاعدہ ہوا اور اب میری صحت بہت اچھی ہوگئی تھی اور مجھے پڑھنے لکھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ پہلے تو جو پیغام میری شادی کا آتا تھا یہ کہہ کر واپس کر دیا جاتا تھا کہ ابھی لڑکی پڑھ رہی ہے اس لئے ابھی شادی نہیں کی جاسکتی۔ مگر اب جب کہ میں تندرست اور ہٹی کٹی ہوگئی تھی تو میرے والدین کو میرے رشتے کا فکر ہوا۔ پیغام تو کئی جگہ سے آئے ہوئے تھے اور آرہے تھے اس لئے بر تلاش کرنے کی انھیں زحمت اٹھانی نہ پڑی۔ اب سوال صرف انتخاب کا تھا۔ اس کا فیصلہ انھوں نے مجھ پر چھوڑ دیا اور بلقیس نے سارے رقعے میرے سامنے لاکر ڈال دئے میں شادی کے نام سے گھبراتی تھی۔ کیونکہ اپنی اکثر سہیلیوں کی آزادی سلب ہوتی دیکھ چکی تھی۔ مگر بلقیس نے پھر ایک طول طویل لیکچر دے ڈالا۔ جس میں اسی بات پر زور دیا کہ

شادی تو بہ مجھے کرنی ہی پڑے گی۔ انکار کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ میں نے بہت کچھ اسے قائل معقول کرنا چاہا مگر اس نے ایک نہ سنی اور مجھے اس قدر مجبور کیا کہ تنگ آکر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ آئے ہوئے رشتوں میں سے ایک کو بہت جلد منتخب کر لوں گی۔ وہ تو اپنے گھر چلی گئی اور میں عجب کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ رقعوں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔ ایک سے ایک اچھا تھا۔ ایک کا دوسرے سے تقابل کرتی رہی۔ بہت سارا وقت اس میں گذر گیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ تمنائی کے خیال نے میرا قلب اور بھی الٹ دیا۔ سوچتی تھی کہ میری رومانی زندگی ختم ہو جائے گی اور شریا ختم ہو جائے گی تمنائی مجھ سے چھن جائے گا اور میں زبردستی کسی اور کے سپرد کر دی جاؤں گی۔ خدا جانے کس قسم کے شخص سے میرا واسطہ پڑ جائے۔ اگر میرے مزاج کے موافق نہ ہوا تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ اسی گو مگو کی حالت میں رات کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں آتے رہے بہت رات گئے نیند آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سینکڑوں بے تکے خواب دیکھے صبح ہوتے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔

خواب میں دیکھتی ہوں کہ ایک پر فضا مقام ہے۔ پودے پھولوں سے اور درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے قریب ہی ایک شفاف چشمہ رواں ہے مگر فضا میں ایک اداسی سی چھائی ہوئی ہے سامنے ایک بارہ دری ہے جس میں ایک عورت منہ پر نقاب ڈالے کھڑی ہے اس کی مضطرب جنبشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی کا انتظار ہے تھوڑی دیر میں ایک نوجوان آتا نظر آتا ہے ہر چیز سے بشاشت ٹپکنے لگتی ہے اسے اسے دیکھ کر مسرت کی لہریں اس عورت کے نقاب پر پڑ جاتی ہیں۔ بڑی

محبت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں پھر ہنسی مذاق اور چہلیں ہوتی ہیں۔ فضا میں پھر ایک مردنی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ نوجوان کی پیشانی پہ بل پڑنے لگتے ہیں چہرہ پہ غصہ اور حقارت کے آثار جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ اٹھتا ہے اور ایک طرف کو چلنے لگتا ہے عورت کی نقاب پہ رنج و غم کی شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ خواب کا بے تکا پن دیکھیے کہ وہ نوجوان جاتے جاتے ایک دم سے جو لوٹتا ہے تو بجائے ایک کے دو نوجوان کھڑے نظر آتے ہیں اور وہ دونوں اس عورت کا رخ کرتے ہیں۔ جب قریب پہنچتے ہیں تو اسکی نقاب پہ حیرانی کے نقوش ابھر آتے ہیں وہ غور سے دونوں کو دیکھتی ہے اور بے حد پریشان نظر آتی ہے دونوں نوجوانوں کی شکل و صورت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہوتا وہ ابھی حیران و پریشان ہی کھڑی ہوتی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مدغم ہونے لگتے ہیں اور پھر وہی ایک نوجوان رہ جاتا ہے جس کے چہرے پہ غصہ کے بجائے دلکش تبسم کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں وہ آگے بڑھ کر اس عورت کی نقاب اٹھاتا ہے اور حالت خواب ہی میں میری چیخ نکل جاتی ہے اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہوں۔ نقاب میں چھپا ہوا چہرہ میرا ہی چہرہ ہوتا ہے۔

عجیب ہنگم خواب تھا۔ کچھ تو ہنسی آئی اور کچھ وحشت سی بھی ہوئی مگر میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ یہ خواب پریشان متخیلہ کا نتیجہ ہے۔ ابھی منہ ہاتھ دھویا اور ارادہ کیا کہ بلقیس کے ہاں جاؤں کیونکہ آج تمنائی کا خط آنے کا دن تھا۔ شادی کا خیال سوہان روح ہونے لگا۔ بلقیس نے کہا تھا کہ مجھے شادی تو کرنی ہی پڑے گی۔ آخر کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ میرے والدین کی مرضی ہے۔ ہر لڑکی کے والدین کی یہی مرضی ہے۔ مگر میرے

والدین اتنے جابر و ظالم نہیں ہیں کہ میری شادی زبردستی کر دیں گے میں تو سرے سے شادی ہی کے خلاف ہوں۔ اپنا اختیار کھو کر پرائے بس میں ہونا۔ یہ ہے شادی عورت کے جادۂ حیات کی یہ وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر اس کے لئے آزادی خیال کی راہیں بھی مسدود ہو جاتی ہیں۔ میں تو ذہنی مسرتوں کی دلدادہ ہوں خوابوں کی بستی میں رہنا چاہتی ہوں۔ تخیل کی نگری بسانی چاہتی ہوں۔ شادی میری مسرتوں کو مجھ سے چھین لے گی۔ میرے خوابوں کو توڑ دے گی میرے خیالوں کو ویران کر دے گی۔ نہیں نہیں میں شادی نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں کروں گی بلقیس سے صاف صاف کہدوں گی کہ اگر میری زندگی چاہتی ہو تو میری شادی نہ ہونے دو۔

ان ہی خیالات میں محو میں بلقیس کے ہاں پہنچی۔ شریر بلقیس کے چہرے پر ہنسی کی لہریں پڑی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی "آیئے رومان صاحب! گھر میں بھی بیٹھا نہ گیا آج آپ سے؟ ایسی بے اختیار ہوئیں؟"

میں نے کہا "شیطان تجھے تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ میرا دل ٹھکانے نہیں ہے۔"

"خیر تو ہے بلقیس نے کہا" کیا ہوا تجھے؟ ابھی خط آیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "مردی خط تو جب آئے گا سو آئے گا۔ جب سے تو نے شادی کا معاملہ چھیڑا ہے میرا تو دن کا چین اور رات کا آرام غارت ہو گیا۔ سارے رقعے میں نے دیکھے مگر میں تو اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ میری شادی میری موت ہو گی۔"

"ہے ہے الوج۔ شیطان کے کان بہرے۔ تو آخر اس قدر بیزار کیوں ہو رہی ہے کہ بات بات پر جان گنوائے دیتی ہے؟" بلقیس نے

ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

میں نے کہا "بلقیس! تم میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ جب میرا دل ہی ایک بات پر نہ جھکے تو مجھے اس پر مجبور کیوں کیا جائے؟"

بلقیس نے دیکھا کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں صمیم قلب سے کہہ رہی ہوں اور مجھے قائل کرنے کی کوشش بیکار ثابت ہوگی۔ چنانچہ اس نے کہا "اگر تمہاری مرضی نہیں ہے شادی کی تو جانے دو۔ مگر دنیا زمانہ کا یہ دستور نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تم کم از کم اتنا کر سکتی ہو کہ شادی کے قضیئے کو ابھی اور ٹال دو۔ کیا خبر آئندہ کیا ہونے والا ہے۔"

"خیر یہ تو کوئی ایسا مشکل امر نہیں ہے۔" بلقیس نے کہا۔

اتنے میں صنوبر خط لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بلقیس نے خط لیا اور چلی گئی۔

خط تمنائی کا تھا۔ وہی شاعرانہ نثر۔ تحریر میں وہی بانکپن۔ خط طویل تھا اور بیحد دلکش دو ایک باتیں خاص طور سے قابلِ غور تھیں لکھا تھا:۔

"........ شاید اس خط کے ساتھ میں بھی دہلی پہنچ جاؤں کہ سمس کی چھٹیاں اس بلد الشعر میں گذارنی چاہتا ہوں جو اپنی آغوش میں میرے خوابوں کی شہزادی کو لئے ہوئے ہے جسکی فضا ثریا کی نظروں سے رنگین تنفس سے معطر اور گفتگو سے مترنم ہے۔ آہ! اس وقت خود مجھ کو اپنے اوپر رشک آئیگا۔ شعر و موسیقی کے پیکر لطیف سے قربت! اس کا خیال ہی مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔ کیسی لذیذ دیوانگی ہے۔ کیسا دلکش جنون

ہے۔ کہ اپنی فرزانگی اس کی نذر کرنا سعادتِ روح سمجھتا ہوں ــــ"

اس خط کو دیکھ کر میری حالت دیوانوں کی ہونے لگی جی چاہتا تھا کہ میں جنونیوں کی طرح کھکھلانے لگوں۔ رنگین فضا میں نغمے تیرتے معلوم ہوتے تھے کائنات کا ذرہ ذرہ چیخ کر محبت کے مدھ بھرے گیت سنا رہا تھا اور مجھے دیوانہ بنا رہا تھا۔ مجھ پہ سکر کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور جب ہوشیار ہوئی ہوں تو دیکھا کہ میرا چہرہ گلاب سے تر ہے اور بلقیس ہے کہ حیران و پریشان نظروں سے مجھے تک رہی ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اس کی جان میں جان آئی اور مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگی "حسنیٰ! یہ تو نے کیا حالت بنائی تھی۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے تو پہلے کبھی تیری ایسی حالت دیکھی نہیں ہے۔ ہے! میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ تو بھلے کو گلاب پاش مجھے اسی وقت نظر آ گیا ورنہ خدا جانے دشمنوں کی طبیعت کا اور کیا حال ہوتا۔"

میں بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کہا "گھبراؤ نہیں بالکل اچھی ہوں۔ ذرا چکر آ گیا تھا۔"

دن بھر بلقیس طرح طرح سے میرا دل بہلاتی رہی اور اپنے مذاق اور چھیڑ چھاڑ سے ہنساتی رہی۔ بدھ کا دن تھا۔ شام کو یہ وہ باغ لے گئی۔ مغرب کے وقت ہم وہاں سے چلے۔ تانگہ پہلے سے کھڑا ہی تھا۔ سوار ہو کر روانہ ہوئے ہم کوئی دو سو قدم گئے ہوں گے کہ خدا جانے کس چیز کو دیکھ کر گھوڑا ابھڑکا اور سرپٹ ہو لیا۔ تانگہ والا راسیں کھینچتے کھینچتے تھک گیا مگر گھوڑا اتھا کہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ میں بلقیس سے لپٹ گئی تھی اور وہ مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ چشم زدن میں ہم دلی دروازے کے باہر نکل گئے

اور ہم لانے قلعہ کی سڑک پر اڑنے چلے جا رہے تھے۔ ہم دونوں پہلے تو ہمت کئے چپکے بیٹھے رہے اور یہی خیال کر رہے تھے کہ اب تانگہ رکا جاتا ہے مگر جب باگیں ٹوٹ گئیں تو ہماری ہمت بھی ٹوٹ گئی اور بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں۔ اتفاق وقت کہ اس وقت راہ گیر بھی اکا دکا ہی چل رہے تھے۔ اور وہ بھی حیرانی اور بے بسی کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے تانگہ برق رفتاری سے چلا جا رہا تھا اور تانگہ والا ہٹو، بچو روکنا کا غل مچا رہا تھا۔ ہمیں موٹر کے ہارن کی آواز دور سے سنائی دی اور پھر قریب سے کئی بار جلدی جلدی ہارن بجا۔ پچاس قدم کے فاصلہ پر سامنے سے موٹر آ رہی تھی اور تانگہ عین اسی کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا۔ جب دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو موٹر ایک دم سے دائیں ہاتھ کو نہایت پھرتی سے بچالی گئی اور تانگہ آگے نکل گیا۔ ہماری چیخیں کسی طرح نہ رکتی تھیں۔ غالباً موٹر والوں نے واقعہ سمجھ لیا۔ کیونکہ موٹر کی پلٹی اور ہمارے تعاقب میں تیزی سے آنے لگی۔ مجھے بس صرف اسی قدر یاد ہے اس کے بعد ہی تانگہ بجلی سے کھمبے سے ٹکرایا اور الٹ گیا۔ میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا اور میں... بے ہوش ہو گئی جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک صاحب مجھ پر جھکے ہوئے میرے سر کو پانی سے دھو رہے ہیں اس وقت پردہ ورده کیسا جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں اٹھ بیٹھی اور منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ درد سے سر پھٹا جا رہا تھا انھوں نے کہا آپ کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ میں نے آپ کا سر دھویا ہے اور یہ کپڑا باندھ دیا ہے۔" میں نے کہا "بلقیس کہاں ہے؟" وہ بے چارے کیا جانیں کہ بلقیس کس کا نام ہے۔ مگر سمجھ گئے اور کہنے لگے "انھیں چوٹ زیادہ نہیں آئی ہے غالباً خوف سے بیہوش

ہوگئی ہیں۔ میں نے انھیں موٹر میں .... سے تکیہ نکال کر لٹا دیا ہو
ابھی ہوشیار ہو جائیں گی۔" یہ سن کر میں اپنی تکلیف تو بھول گئی اور جھٹ
بلقیس کی طرف چلی۔ اسی وقت اسے بھی ہوش آگیا اور غیر مرد کو دیکھ کر شرم
و حیا سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ جلدی سے اس نے اپنا برقعہ اوڑھ لیا اور
مجھ سے کہنے لگی "چوٹ تو نہیں لگی کہیں؟" میں نے اس وقت بتانا اسے
مناسب نہ سمجھا اور کہا "نہیں۔ تمھارے تو نہیں لگی؟" اس نے کہا
معلوم تو ہوتا نہیں"۔ سامنے تانگہ پڑا تھا۔ ایک پہیہ ٹوٹ کر چورا ہو گیا تھا
گھوڑا نہایت اطمینان سے چرنے میں مصروف تھا۔ تانگہ والا سر جھکائے
تانگے کے پاس کھڑا ٹوٹے پہیے کو دیکھ رہا تھا۔

موٹر میں اور کوئی نہیں تھا۔ موٹر والے صاحب ہم دونوں کو باتیں کرتا
دیکھ کر پرے ہٹ گئے اور تانگہ والے سے کچھ کہنے سننے لگے۔ ان کے
طرز گفتگو اور وضع قطع سے شرافت ٹپکتی تھی وہ پھر ہمارے قریب آئے اور
نیچی نظریں کیے ہم سے بے پردگی کی معذرت کرنے لگے۔

میں نے کہا "آپ ہمیں ناحق شرمندہ کرتے ہیں۔ ہم آپ کا شکریہ کسی
طرح ادا نہیں کر سکتے۔ کیا ہم اپنے محسن کا نام دریافت کر سکتے ہیں؟"

انھوں نے میرے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے کہا: "اگر آپ اجازت
دیں تو آپ کو آپ کے دولت خانہ پر پہنچا دوں۔ اس وقت اور ایسے مقام
پر کسی اور سواری کا انتظام ناممکن ہے۔ تانگہ والے کو میں نے اپنے گھر کا پتہ
بتا دیا ہے۔ کل صبح اس کا حساب کر دیا جائے گا۔" ہم نے شکریہ کے ساتھ
اس اقدام کو قبول کیا اور موٹر میں جا بیٹھے۔ بلقیس نے انھیں اپنے گھر کا پتہ
بتایا اور موٹر روانہ ہو گئی۔ راستے میں میں نے دو دفعہ اور ان سے نام پتہ

معلوم کرنا چاہا مگر آدمی تھے بڑے سلیقے کے۔ بڑی خوب صورتی سے اور باتوں میں ٹال گئے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ حضرت چھپانا چاہتے ہیں اور ان کی شرافت کا نقش میرے دل پر اور بھی گہرا ہو گیا۔ بلقیس کے گھر پہنچ کر انھوں نے ہارن بجایا اور بھائی جان (بلقیس کے دولھا) آواز سن کر باہر نکل آئے۔ ہم موٹر میں سے اتر آئے تھے۔ بلقیس کو دیکھ کر انھوں نے کہا "تم کیسے؟ اور یہ کون حسینہ ہیں؟" بلقیس نے کہا ہاں ابھی بتاتی ہوں۔ تم انھیں تو بٹھاؤ۔" اس نے موٹر والے صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ بھائی صاحب نے ان سے ہاتھ ملایا اور انھیں لا کر بٹھایا پھر دو منٹ کے لئے ہمارے پاس آئے اور پوچھا۔" یہ آخر معاملہ کیا ہے؟" بلقیس نے بہت تھوڑے لفظوں میں ماجرا سنایا تو وہ لپکے ہوئے گئے ان کے پاس اور ان کا بہت بہت شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا "اب آپ میرے ساتھ کھانا کھائے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے۔" وہ بہت گھبرا رہے تھے اور جلد چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے کہنے لگے:۔

"مجھے آج نو بجے ایک جگہ شریک طعام ہونا ہے ورنہ ضرور آپ کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاتا۔"

"اچھا تو پھر کل کسی وقت کا وعدہ کیجئے۔" بھائی صاحب نے کہا: میں کل کس وقت آپ کا منتظر رہوں؟"

"میں کل شام کو حاضر ہو سکوں گا۔ کیونکہ کل دن کو بھی ایک دوست کے ہاں وقت کا تعین ہو چکا ہے۔ اب اجازت دیجئے۔" انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ اس وقت جلدی میں ہیں اس لئے میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا

تاہم کیا میں آپ کا نام جاننے کا فخر حاصل کر سکتا ہوں ؟"
بھائی صاحب نے میرا سوال ان سے پھر دوہرایا۔
وہ اپنا نام نہ بتانا چاہتے تھے اس لئے کچھ پریشان سے نظر آئے مگر اب ٹالنا ممکن نہ تھا اس لئے خاموشی سے اپنا کارڈ نکال کر پیش کر دیا اور کہا :-
"مجھے بھی اپنے اسمِ گرامی سے آگاہ کر کے مرہونِ منت کیجئے"
"مسٹر اشرف مجھے آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی اور میں آپ کی ہمدردی اور مہربانی کا شکر گزار ہوں، میں بھی اپنے نام کا کارڈ پیش کرتا ہوں"
یہ کہہ کر بھائی صاحب نے اپنا کارڈ نکال کر دیا۔
"شکریہ مسٹر صہبائی! آپ نے اپنی خوش اخلاقی سے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ کل شام کو آپ سے مفصل گفتگو ہوگی" یہ کہہ کر انھوں نے ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔ بلقیس نے بھائی صاحب سے کارڈ لے کر مجھے دیا۔ اس پر محمد اشرف ایم۔اے ڈپٹی کلکٹر لکھا ہوا تھا۔
رات کے نو بج رہے تھے۔ بلقیس نے کہا "ایسی صورت میں تو میں تمھیں گھر نہ بھیجوں گی۔ بی اماں کو تمہاری چوٹ کا حال معلوم ہو گیا تو خفا ہوں گی آج تم نہ جاؤ۔ میں انھیں پرچہ لکھ کر بھیجے دیتی ہوں۔ کہ آج تم نہیں آؤ گی۔ کل شب کو ایک صاحب کی دعوت ہے اس لئے میں نے تمھیں روک لیا ہے کہ انتظام میں میرا ہاتھ بٹاؤ گی"
میں نے کہا "اچھا۔ تم انھیں ابھی لکھ کر بھیج دو۔ وہ پریشان ہو رہی ہونگی"
بلقیس نے پرچہ لکھ کر بھیج دیا اور تھوڑی دیر بعد جواب بھی آ گیا۔ اماں بی نے لکھا تھا کہ پرسوں اسے ضرور بھیج دینا اس کے بغیر گھر سنسان رہتا ہے۔

رات کو بہت دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ "تانگہ کا واقعہ اور پھر مسٹر اشرف کی ہمدردی کا ذکر ہوا۔ میرے دل میں تو ان کی شرافت کھب گئی تھی!

اگلے دن میں نے تمنائی کے خط کا جواب لکھا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ رات سے ایک بات میں اور بھی محسوس کر رہی تھی۔ مسٹر اشرف کا چہرہ آنکھوں میں بار بار پھر رہا تھا۔ کتنا خوب صورت اور کتنا شریف!

شام کو وہ حسب وعدہ آئے اور میں نے جب تک انھیں جھانک کر نہ دیکھ لیا۔ چین نہ آیا۔ پھر اپنی اس حرکت پر ہنسی بھی کہ یہ کیا حماقت تھی۔ بہت خوش مزاج اور خوش مذاق آدمی معلوم ہوتے تھے۔ بھائی صاحب سے بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ جب وہ گئے ہیں تو ان دونوں میں گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ آتے رہے اور میرے سر کے زخم کے متعلق خاص طور سے پوچھ لیتے تھے۔ بھائی صاحب کی زبانی انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں کون ہوں۔ ان کے خاندانی حالات بھی معلوم ہو چکے تھے۔ دہلی کے ایک شریف گھرانے کے فرد تھے والدین کا انتقال زمانہ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا جو کچھ پڑھا لکھا تھا اپنے ذاتی ذوق و شوق سے آدمی بہت ذہین تھے۔ علی گڑھ سے ایم اے پاس کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری مل گئی۔ سات سال سے یو۔ پی کے مختلف مقامات میں متعین ہوتے رہے۔ آج کل میرٹھ میں ہیں۔ شادی اب تک نہیں کی۔ بھائی صاحب سے ان کے تعلقات اتنے گہرے ہو گئے کہ ہر اتوار کو دہلی ان کے پاس آ جاتے تھے۔ تانگہ والے کے واقعات کو تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس عرصہ میں تمنائی کے تین خط آنے چاہئیں تھے مگر اب تک کوئی خط نہ آیا تھا۔ میرا خیال تو ضرور

لگا ہوا تھا مگر وہ بے چینی نہیں تھی۔ جو پہلے رہا کرتی تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے صرف تمنائی کا خیال میرے تخیل کی دنیا پر چھایا رہتا تھا اور اب جب سے مسٹر اشرف کو دیکھا تھا ان کی صورت اور باتیں رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔ تمنائی کی مراسلت اگر جاری رہتی تو شاید مسٹر اشرف کا خیال اتنا جاگزیں نہ ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں اتوار کے دن بلقیس کے ہاں ضرور پہنچ جاتی اس بات کو بلقیس بھی تاڑ گئی تھی اور ایک دن اس نے منہ پر کہہ ہی دیا۔

"کیوں بنو! یہ زخم سر میں آیا تھا یا دل میں؟" اس نے شرارت سے کہا

میں نے خندہ رہ کر پوچھا "دل کا زخم کیسا؟"

کہنے لگی" اری رہنے دے خندی۔ کیوں باتیں بناتی ہے۔ اب مجھ سے بھی دل کے بھید چھپانے لگی؟"

میں نے کہا" بلقیس! تو بڑی نظر باز ہے اب تجھ سے کیا کہتی ان باتوں کو اپنا گھٹنہ کھولو اور آپ ہی لاجوں مرو۔"

بلقیس بولی" ہوں! تو یہ آگ دو طرفہ ہے! جبھی تو میں کہوں کہ آخر یہ اتوار کا پھیرا ناغہ کیوں نہیں ہوتا اور ہاں اب وہ تمہارے تمنائی کہاں گئے"

میں نے کہا" اچھا اب مذاق کو تو چھوڑو اور ڈھنگ کی بات کرو۔ تمنائی نے اتنے دن سے کوئی خط نہیں بھیجا یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ میں کسی کے گلے زبردستی تو پڑتی نہیں وہ خاموش ہیں تو میں نے بھی چپ سادھ لی۔"

"ہاں ان کی بھی کسی عورت سے مدھ بھیڑ ہو گئی ہوگی۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ سب رومان دھرا رہ جائے گا۔"

بلقیس نے فتحمندانہ لہجہ میں کہا" تو تو سرے سے شادی ہی کے

خلاف ہے اب میں تجھ سے اور کیا کہوں ؟ "

میں نے ہنس کر کہا " میں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر سکتی ہوں "

" ہاں اگر یہ ممکن ہو تو میں تجھے ایک خوش خبری سناؤں ۔ کل ہی تیرے بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ حسنی کی شادی اگر اشرف سے ہو جائے تو کیا برائی ہے میں نے کہا برائی تو کوئی نہیں ہے اور اس سے بہتر رشتہ اور ہو بھی نہیں سکتا ۔ انھوں نے کہا تم حسنی کا عندیہ لو اگر وہ راضی ہو تو اشرف کا پیغام بھجوا دیں ۔ انھوں نے مجھ سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تھا ، میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اپنی اہلیہ سے پوچھ کر کوئی جواب دے سکوں گا ۔ بول ! اب کیا کہتی ہے ؟ "

میں نے کہا " تو پیغام بھجوا دے ، جہاں اور آئے ہوئے رکھے ہیں ، انھیں میں اسے بھی شامل کر لیا جائے گا ۔ پھر غور کریں گے کہ کس سے شادی کیجائے "

اس نے ایک زور کی چٹکی لی اور کہا " اور وہ تیرا رومان ؟ اس موئے کا کیا حشر ہوگا ؟ "

میں نے کہا اس پر بھی غور کیا جائے گا اور ہنسنے لگی ۔

دوسرے دن بلقیس اماں بی کے پاس پہنچیں اور اشرف کی تعریفوں کے پل باندھ دئے ۔ انھوں نے کہا ۔" اگر حسنی اس رشتہ کو پسند کرلے تو ہمارا فکر دور ہو جائے "انھیں بچاری کو کیا خبر کہ کیسے کیسے انقلابات ہو گئے ۔

اتوار کو اشرف صاحب بھائی صاحب کے پاس آئے تو ان کیطرف سے پیغام بھیجدیا گیا اور ابا میاں نے بھی اسے بہت پسند کیا ۔ اماں بی کو دیکھا تو بھلا سوائے تعریفوں کے اور کیا کرتیں ۔ بلقیس نے پہلے ہی انھیں پکا کر لیا تھا ۔ غرض بات طے ہو گئی ۔ جہیز تو تیار ہی تھا اور سب تیاری بھی ہو گئی اور

میری شادی ہوگئی۔

میں وداع ہوکر میرٹھ گئی۔ بہت عمدہ سجی سجائی کوٹھی تھی۔ ہر چیز سے اعلیٰ مذاق ٹپکتا تھا۔ اشرف صاحب بہترین شوہر ثابت ہوئے۔ ہم دونوں میاں بیوی میں بہت ہی خلوص و محبت تھی۔ محبت کی ابتدا تو اسی دن ہوگئی تھی جس دن تانگہ کا سانحہ ہوا تھا۔ اشرف صاحب نے شادی کے بعد مجھے بتایا کہ میری بے ہوشی کے مختصر وقفے میں انھیں مجھے بغور دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور اسی وقت میری محبت ان کے دل میں جاگزیں ہوگئی تھی۔ مجھے بھی اقرار ہے کہ اشرف صاحب کو دیکھ کر میرے خیالات کی رَو نے ایک اور ہی سمت اختیار کر لی تھی۔ میرے لئے اب دن عید اور رات شب برات تھی۔ ایک عورت کے لئے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے ایک چاہنے والا شوہر مل جائے۔ ایک سال پلک جھپکاتے میں گذر گیا۔ اس عرصہ میں مجھے تمنائی کا خیال کئی دفعہ آیا۔ مگر میں نے فوراً ہی اسے دل سے .... نکال دیا۔ کیونکہ میرے لئے اب انھیں بھول کر بھی یاد کرنا گناہ تھا۔ میں اب اشرف صاحب کی ہو چکی تھی اور ان کی محبت میرے ہر رگ و ریشے میں رچ رہی تھی۔ تمنائی نے اس عرصے میں مجھے کوئی خط نہیں لکھا اور میں نے بھی اسے بہت غنیمت سمجھا بلکہ اکثر خائف رہتی تھی کہ کہیں ان کا نامہ شوق نہ آجائے۔ واقعات کی اس ستم ظریفی کو دیکھئے کہ یا تو یہ کیفیت تھی کہ ان کے خطوں کو ترستی تھی یا اب یہ حالت تھی کہ ان سے ڈرنے لگی تھی۔ شاید تمنائی کی یاد مجھے اس لئے اور بھی کم آتی تھی کہ اشرف صاحب کے خیالات ان سے بہت ملتے جلتے تھے۔ یہ حضرت بھی اسی قدر مبالغے سے میری تعریف کرتے تھے جس قدر کہ تمنائی۔ میری روح تڑپتی تھی اتحاد و اشتراک خیال کے لئے یہی

وجہ تھی کہ تنہائی سے سلسلہ خط وکتابت قائم ہوگیا تھا مگر جب اشرف صاحب کے ساتھ بھی مجھے یہ نعمت میسر آگئی (بلکہ خیال کے ساتھ عمل میں بھی) تو تنہائی کا اثر مجھ پر سے اٹھ گیا۔

ہمیں دنیا بھر کا عیش و آرام میسر تھا۔ اشرف صاحب ہر وقت میرا ہی دم بھرتے تھے اور میں انھیں دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ دوسرا سال بھی ختم ہونے کو آیا جب اشرف صاحب گھر پر نہ ہوتے تھے تو میرا بیشتر وقت امورِ خانہ داری میں گذرتا تھا اور جو کچھ بچتا تھا مطالعہ میں صرف ہوتا تھا مگر اس پر بھی میں اپنی روح میں کسی چیز کی کمی پاتی تھی ایک تشنگی سی تھی جو خالی اوقات میں شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ مجھے خطرہ ہو چلا تھا کہ کہیں میرا نخلِ حیات بے ثمر رہ جائے اس کا تذکرہ میں نے اشرف صاحب سے کیا تو انھوں نے میری خوب ہنسی اڑائی اور کہا "آج کل کی متمدن دنیا جسے عذابِ جان قرار دے رہی ہے تم اسے راحتِ روح سمجھ رہی ہو۔ تم بڑی خوش نصیب ہو کہ اولاد کے جھنجھٹ سے بچی ہوئی ہو۔ اس کی مصیبتوں پر تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ ذرا اسی ایک سوال کا جواب دیدو کہ آخر اولاد سے والدین کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟"

میں نے غور کیا تو واقعی تکلیف ہی تکلیف نظر آئی۔ دس بارہ مثالیں دے کے انھوں نے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کر دیا۔ خود میں نے اپنی کئی سہیلیوں کو جھیکتے دیکھا ہے۔ خاموش ہو رہی مگر قلب کی بے چینی نہ گئی۔ خدا جانے یہ میری کیا کمزوری تھی کہ اولاد کی بیحد متمنی تھی، شاید میری اور بے اولادی بہنوں کو بھی اس جذبۂ بے اختیاری کا تجربہ ہو۔ پھر یہ حالت ہوگئی کہ شب و روز اسی کی آرزو اور افسردگی رہنے لگی۔ اشرف صاحب نے مجھے بڑی محبت سے سمجھایا کرتے تھے۔ مگر میں اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ میری صحت خراب رہنے لگی

اور علاج معالجہ سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ میں دیکھتی تھی کہ اشرف صاحب بھی میری علالت کو دیکھ کر کڑھتے تھے اور اکثر ناراض بھی ہوتے تھے۔ تین مہینے اور گذر گئے۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے محسوس کیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ میرا خیال غلط نہیں ہے تو میں نے نہایت مسرت سے اشرف صاحب سے اس کا ذکر کیا مگر میری ساری خوشی خاک میں مل گئی جب میں نے دیکھا کہ انھوں نے اس خبر کو اس طرح سنا یا کوئی وحشت ناک خبر تھی۔ گھبرا کر بولے "حسنیٰ! تم مجھ سے چھن گئیں" اور فوراً باہر چلے گئے۔ بات گئی گذری ہوئی۔ میری صحت اچھی ہونی شروع ہوگئی مگر اشرف صاحب کی نظریں کہتی تھیں کہ وہ مجھے اسی محبت اور پیار سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ میں طرح طرح سے ان کا جی بہلاتی تھی اور انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر ان کے مزاج کی اداسی بڑھتی جاتی تھی جب میرے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو ان کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ فی الحقیقت انھیں روحی صدمہ ہوا ہے۔

سلمیٰ جس دن سے پیدا ہوئی تھی بیمار چلی جاتی تھی۔ میرا دم ہولوں ہی میں جا رہا تھا۔ کمزور بچی تھی ذرا سی بیماری بھی بہت معلوم ہوتی تھی، اشرف صاحب کا یہ کہنا کہ تم مجھ سے چھن گئیں، بڑی حد تک صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ میں خود محسوس کر رہی تھی کہ میری تمام تر توجہ ان سے ہٹ کر بچی کی طرف ہوگئی تھی۔ میرا دن کا چین اور رات کا آرام تو بچی کے پیچھے گیا ہی تھا، اشرف صاحب کی زندگی بھی حقیقتاً بڑی بے لطف ہوگئی تھی۔ یا تو ان کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت ان کا چہرہ پھول کی طرح کھلا رہتا تھا یا اب دونوں ان کے منہ پر مسکراہٹ بھی نہ آتی تھی۔ میں بچی کے معاملہ میں اس قدر رقیق القلب ہوگئی تھی کہ ذرا اس

کی طبیعت بگڑی اور میری حالت دیوانوں کی سی ہو گئی۔ اشرف صاحب کو بھی پریشان کر دیتی تھی کہ " ابھی ان ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ وہ بچوں کا خاص طور سے علاج کرتے ہیں " دیکھا ان کے علاج سے تو فائدہ نہیں ہوا فلاں حکیم جی کو دکھا دو۔ دیکھو تو سہی نگوڑی کا کلھیا سا منہ نکل آیا۔ اے ہے! اس کی تو حالت گرتی ہی جاتی ہے۔ یہ محلے میں جو پنڈت جی رہتے ہیں وید ک علاج کرتے ہیں انھیں بلا کر ذرا دکھا دو۔" غرض وہ بچارے بھی بچی کی آئے دن کی بیماری سے تنگ آ گئے تھے۔ مرد ذات کہاں تک سہار کرے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی کانوں میں بچی ٹیں ٹیں کی آواز پڑتی۔ جب تک گھر میں رہتے اسی کا رونا سنتے۔ انھوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ گھر کا رہنا بھی بہت کم کر دیا۔ مجھے اس پر غصہ آیا اور میں نے ایک دن انھیں سختی سے ٹوکا وہ کچھ نہ بولے اس پر اور بھی تاؤ آیا۔ میں بھی منہ پھلا کر پڑ گئی۔ پہلے وہ میری خوشنا تک کر لیتے تھے۔ مگر اب منانے بھی نہ آئے۔ میں نے رو رو کر آنکھیں لال کر لیں۔ مگر اس اللہ کے بندے نے الٹ کر یہ بھی جو پوچھا ہو کہ نیک بخت تو روتی کیوں ہے۔ غرض کچھ ایسے گم سم ہوئے کہ نہ منہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔ رات ہی کو میں نے یہ طے کیا کہ کل دن کی گاڑی سے دہلی چلی جاؤں گی۔ کچھ دنوں الگ رہیں گے تو شاید مزاج ٹھیک ہو جائے گا۔ دہلی میں بچی کا علاج بھی اچھا ہو سکے گا۔ صبح اٹھ کر میں نے ناشتہ تیار کرایا اور جب ناشتہ کرنے بیٹھے تو میں نے کہا " ننھی کا جی ٹھیک نہیں ہے۔ ...... اور آپ کو بھی بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ میں آج دہلی جا رہی ہوں۔"

کہنے لگے " تمھیں اختیار ہے۔"

میں نے دیکھا کہ مزاج ابھی درست نہیں ہوا ہے اس لئے چپکی ہو

رہی۔ انھیں کہیں باہر معائنہ کرنے جانا تھا۔ چلے گئے اور میں دہلی روانہ ہوگئی دہلی میں پہنچی تو بلقیس کو سب سے پہلے بلا بھیجا۔ اماں بی سے میں نے صرف یہی کہا تھا کہ نھی کے علاج کے لئے دہلی آئی ہوں۔ بلقیس آئی تو میرے اچانک آنے پر اظہار تعجب کرنے لگی۔

"اری تو یہ ایکا ایکی کیسے نازل ہوگئی؟"

"تمہارے بہنوئی سے لڑ کر آئی ہوں"۔ میں نے کہا۔

بلقیس نے کہا "خدا خیر کرے، میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے جو یوں بے اطلاع کے آئی ہے سنا تو سہی آخر ہوا کیا؟"

میں نے کل کیفیت بیان کی۔ سن کر کہنے لگی "بڑے افسوس کی بات ہے۔ اشرف صاحب تو بہت سمجھ دار آدمی ہیں۔ انھوں نے تمہاری مجبوریوں کو کیسے نظر انداز کر دیا؟"

میں نے کہا "بوا ذرا دیکھو تو سہی اس میں بھلا میرا قصور کیا ہے؟ بچی پیدا ہوئی میری خطا؟ بچی بیمار رہنے لگی، میرا گناہ؟ اب جو وہ مجھ سے کھنچنے لگیں تو بھلا میں کیا کروں؟"

"ہاں سچ تو ہے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ مگر تو نے ایک غلطی کی اور وہ یہ کہ انھیں چھوڑ کر یہاں چلی آئی"۔ بلقیس نے کہا۔

"میں تو اس خیال سے آگئی کہ شاید اس عارضی جدائی سے ان کے خیالات کچھ سدھر جائیں اور انھیں اس کا احساس ہو جائے کہ میں کس قدر مجبور ہوں"۔ میں نے کہا۔ "شاید تنہائی کی گھڑیاں انھیں کچھ سکھا سکیں"۔

"بلقیس نے کہا ہاں یہ بھی ممکن ہے۔ پھر بھی تمھیں یہاں زیادہ دنوں نہیں رہنا چاہیئے۔ ہفتہ عشرہ میں واپس چلی جانا۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ

کہیں تمہارے پیچھے خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔ وہ ایں آج کل پریشان سکون تلاش کرنے میں ان سے کوئی لغزش نہ ہو جائے"

میں نے بھی بلقیس کے کہنے کی صداقت کو محسوس کیا اور کہا" ہاں کچھ دنوں بعد چلی جاؤں گی۔ ننھی کی طرف سے ذرا اطمینان ہو جائے" رات کو بلقیس چلی گئی۔

مجھے دہلی آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اشرف صاحب کا کوئی خط نہ آیا خیال تھا کہ وہ خط ضرور لکھیں گے مگر ان کی خاموشی سے بہت مایوسی ہوئی اشرف صاحب کی اس رکھائی نے دل خون کر دیا۔ میں غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتی جارہی تھی کہ یکایک کسی نے مجھے سہارا دیا۔ یہ تمنائی کا خیال تھا جس نے مجھے اس کی گہرائیوں میں سے نکال کر پھر ساحل حیات پہ لا کر کھڑا کیا۔ آہ! ماضی کی خوشگوار یاد نے میٹھی میٹھی چٹکیاں لے کر دل میں نیل ڈال دئے اور عالم بے اختیاری میں میری آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو ٹپک پڑے۔ ضمیر نے کہا اب تمنائی کی آرزو کرنا گناہ ہے۔ دل نے کہا جس کی وجہ سے خیال بھی گناہ ٹھیرا جارہا ہے جب اسی کو تیری پرواہ نہیں تو پھر اپنی جان کیوں ہلکان کرے؟ اسی کشمکش میں خاصی دیر لگ گئی اور میں کسی نتیجہ پہ پہنچ نہ سکی اس میں شک نہیں تھا کہ میں مظلوم ہوں اور میری مجبوریوں کا اشرف صاحب کو احساس نہیں ہے۔

میں نے اٹھ کر ادیب کا وہ پرچہ نکالا جس میں" رباب شکستہ" شائع ہوا تھا۔ اپنے مضمون کا ایک ایک لفظ میں نے غور سے پڑھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ میں نے اپنی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ اب سے تین سال پہلے کھینچ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اپنے ہی بارے میں پیشین گوئی

کی تھی۔ "رباب شکستہ" حرف بحرف مجھ پر صادق آرہا تھا۔ پھر میں نے تمنائی کے خطوط کا پیکٹ نکالا اور ایک ایک خط پڑھنا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے مطالعہ سے میری روح تازہ ہو رہی ہے۔ بے اختیار جی چاہا کہ عہد رفتہ دوبارہ آجائے دل نے تڑپ کر کہا یہ تو تیرے ہی ہاتھ میں ہے قلم اٹھا اور تمنائی کو خط لکھ دے۔ ضمیر نے پھر اپنے نشتروں سے کچوکا۔ میں نے کہا اشرف صاحب مجھ سے کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہو جائیں میں انھیں دھوکہ نہیں دوں گی، نہیں دے سکتی،

میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جذبات میں ہیجان بپا تھا، میں نے قلم اٹھایا اور لکھنے لگی "رباب شکستہ" کے بعد میں نے کچھ نہیں لکھا تھا اور کاموں سے فرصت ہی اتنی نہ ملتی تھی کہ کچھ لکھوں۔ پہلے سکونِ خاطر مہیا تھا۔ اطمینان سے مضمون لکھ لیا تھا۔ اب اضطراب دل نے مجھ سے مضمون لکھایا۔ یہ مضمون بھی پہلے مضمون سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ تخیلات تھے اور یہ تاثرات۔ مضمون مکمل ہو گیا تو میں نے اس کا عنوان "افسردگی کی آرزو" تجویز کیا۔ ادیب ایک عرصہ سے نہیں آیا تھا۔ غالباً بند ہو چکا تھا۔ ان دنوں "سنبلستان" ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھا۔ میں نے مضمون صاف کر کے اس میں ثریا کے نام سے بھیج دیا دو ہفتہ بعد جو پرچہ شائع ہوا اس میں "افسردگی کی آرزو" مع ایک طویل ایڈیٹوریل نوٹ کے شائع ہوا۔ نوٹ میں "رباب شکستہ" کا حوالہ بھی تھا اور لکھا تھا کہ یہ انھیں نامور خاتون کا مضمون ہے۔ پرچہ شائع ہونے کے تین دن بعد ایڈیٹر "سنبلستان" کی معرفت میرے نام ایک خط آیا۔ انداز تحریر دیکھتے ہی میں پہچان گئی کہ تمنائی کا ہے۔ جلدی سے کھولا۔ خط یہ تھا :-

ثریا

اتنے عرصہ میں تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ تم میری اس طویل خاموشی سے ناراض ہوگی۔ مگر سچ جاننا ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ادیب کبھی کا بند ہو چکا۔ اس کے ایڈیٹر کا بھی انتقال ہو گیا۔ تمہارا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا اور نہ تمھیں میرے پتہ کا علم۔ تمہیں خط کیسے بھیجتا دل مسوس کے رہ گیا "سنباستان" میں ابھی ابھی تمھارا مضمون "افسردگی کی آرزو" دیکھا۔ مدت کی دبی ہوئی چوٹ ابھر آئی۔ دل کے پرانے زخم خون دینے لگے اسی خون سے تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ شاید تمھیں بھی میری بیکسی پر رحم آجائے۔

میں نے اپنے آخری خط میں تمھیں لکھا تھا کہ میں عنقریب دہلی آنے والا ہوں۔ میں دہلی آیا تھا اور بیحد مسرور تھا کہ ثریا کے دیس میں سانس لے رہا ہوں۔ میں خوش تھا کہ میں وہاں ہوں جہاں میرے رنگین خواب کی خوب صورت تعبیر ہو رہی ہے۔ اس خطۂ پاک کا ہر ذرہ چمک کر مجھے ثریا کا پتہ دے رہا تھا۔ یہاں کی فضا میں خمار و مستی کی سی ملی جلی کیفیت تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ میری ثریا کی نشیلی انکھڑیوں میں ہر وقت شراب ڈھلتی رہتی ہے۔ میری روح کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی کہ ناگاہ مجھے ایک سراب نظر آیا آہ! میں کیسے کہوں کہ تمہارا تمنائی بہک گیا۔ میری زندگی کے صحرا میں ایک رنگین بگولہ اٹھا اور میں اس میں گم ہو گیا۔ میں اپنی اس کمزوری کا تم سے کس طرح اقرار کروں کہ ایک عورت نے مجھے

شکست دے دی حسن کی بے پناہ ساحرانہ قوتوں نے مجھے بے اختیار کر دیا اور مجھ سے بھی وہ لغزش ہوگئی جو ایک کمزور انسان کا خاصۂ طبعی ہے۔ شادی! کس قدر خوشنما فریب، کیسا دلکش دھوکہ! بنات سے زیادہ خوب صورت اور زہر سے زیادہ خوش رنگ۔ میں اس سانپ سے کھیلتا رہا، اس کی زہریلی فطرت سے بے خبر، اس کے مقتضائے طبیعت سے بے پروا، اس کی ہلاکت آفریں پھنکار کو محبت کا جاں نواز نغمہ سمجھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے ڈس لیا۔ اس زہر کو میں نے جوہر حیات سمجھ کر چکھا اور اس کی مٹھاس نے میری عقل سلب کر لی۔ میری بصارت و بصیرت مفلوج ہوگئی اور میں اس خوش ذائقہ زہر کو کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ جب ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ زندگی کے خون کی بجائے میری رگوں میں موت کا لہو گردش کر رہا ہے۔ سانپ نکل چکا تھا اور اب صرف اس کا اثر باقی تھا۔ آہ! میرے خوابوں کے جزیرے ویران ہو چکے تھے اور اس ویرانے میں تمناؤں کی پریشان روح بھٹکتی پھر رہی تھی۔ یہ ہے مختصر روئیداد اس شخص کی جو اپنے آپ کو مقدس فرشتوں سے بھی اعلیٰ و ارفع سمجھتا تھا۔ مگر اب حقیر انسان سے بھی خود کو کمتر اور ذلیل پاتا ہے۔

"رباب شکستہ" کی طرح "افسردگی کی آرزو" میں بھی خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ مگر اس نقشِ ثانی میں وہ تمام شدتیں بروئے کار آ گئی ہیں جن کی جھلک نقشِ اول میں نظر آتی تھی۔ جس طرح چھری گلے مل کر تڑپ کو اور بڑھا دیتی ہے اسی طرح تمہارے

مضمون نے میرے تڑپنے اور تڑپتے رہنے کا سامان مہیا کر دیا۔ ثریا مجھے نہیں معلوم کہ جب سے ہماری مراسلت اتفاقاً ختم ہوئی تم پر کیا بیتی۔ تاہم میں دست بدعا ہوں کہ میرے سوال کے جواب میں یہی کہہ سکو کہ یہ مضمون بھی پہلے کی طرح محض تخیلی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ جس عورت کے دل و دماغ پر مایوسیاں اس قدر غلبہ پا چکی ہوں وہ زندہ بھی رہ سکتی ہے یا نہیں جس کی کیفیت یہ ہو گئی ہو کہ ہنسنے میں بھی آنسو نکل پڑتے ہوں اس سے زیادہ قابل رحم اور کونسی ہستی ہو سکتی ہے۔ تمہارے مضمون سے زیادہ غم انگیز جذبات میں نے آج تک کسی اور مضمون میں نہیں دیکھے ایسی دکھ بھری داستان میں نے آج تک نہیں سنی۔ تمہارے مضمون کا خصوصاً وہ حصہ جہاں تم نے ماضی اور حال کا تقابل پیش کیا ہے اس درجہ دردناک ہے کہ حساس طبیعتیں اسے پڑھ کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکیں گی۔۔۔۔۔۔ میں اسے پڑھتا تھا اور روتا تھا، روتا تھا اور پڑھتا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دوں اور اس کے ہر حرف پر اپنے آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتا جاؤں:۔

چاند نے آسمان پر کھیت کیا۔ اس کی ٹھنڈی پیلی روشنی ہر چیز پہ پھیل گئی۔ یہ سماں میں نے پہلے بھی کئی دفعہ دیکھا تھا اور اس وقت میرے دل کی دھڑکن کہتی تھی کہ کوئی نئی نویلی دلہن ہے جو سونے میں پیلی اور موتیوں میں سفید ہو رہی ہے

اس کا تبسم ہے کہ گھونگھٹ میں سے پھوٹے پڑتا ہے
اور دولت زر بن کر کائنات میں بکھرا جاتا ہے۔ اب
بھی وہی رات ہے وہی چاند، مگر میرے من کی
اداسی کہتی ہے کہ یہ تو کسی عورت کی نعش ہے جس
کے چہرے پر موت کی بھیانک زردی کھنڈی ہوئی
ہے پہلے خوشی سے میری رگوں میں زندگی کا گرم
خون چھلکنے لگتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی
ہر لہر میں مسکراہٹیں گھلی ہوئی ہیں مگر اب میرے
ہر رگ و ریشے میں موت کی سی ٹھنڈک گردش کرنے
لگی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کے گرم گرم آنسو
میری روح کو داغ رہے ہیں۔ پہلے رنگین فضا
میں مسرت کے قہقہے منتشر ہوتے نظر آتے تھے مگر
اب بد رنگ فضا میں کرب کی چیخیں گھلی ملی نظر آتی
ہیں دور سے کسی کے گانے کی آواز رات کے سناٹے
میں تیرتی ہوئی آئی۔ میں نے جانا جیسے کوئی میری
مردہ حسرتوں کا نوحہ سنا رہا ہے "

ثریا! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ فقرے کس جذبہ کے
ماتحت لکھے ہیں؟ مجھے تو ان کی آڑ میں تمہارا چہرہ بھی آنسوؤں سے
تر نظر آرہا ہے۔ میں محبت نا جنس کا شکار ہوں۔ کیا تم نے یہ آنسو
مجھ ہی پر بہائے ہیں؟ اگر واقعہ یہی ہے تو میں تمہارا شکریہ کس
طرح ادا کروں؟ مجھے اپنے واقعات سے مطلع کرو۔ خدا کرے کہ

تم خیریت سے ہو۔

تمہارا
تمنائی!

تمنائی کے خط کے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مگر یہ معلوم کر کے افسوس بھی ہوا کہ وہ بھی میری طرح ناخوشگوار شادی کی مصیبت میں مبتلا ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ یہ حضرت بھی اشرف صاحب کی طرح اپنی بیوی سے خوامخواہ ناراض ہو گئے ہوں اور وہ بچاری میری طرح بے لطف زندگی کے دن گذار رہی ہو۔ اس خیال کا آنا ہی تھا کہ مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔ مرد عموماً عورتوں ہی کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ عورت کس قدر مجبور ہو جاتی ہے۔ ماں بننے کے بعد اس کی ذمہ داریاں کتنی بڑھ جاتی ہیں۔ مردوں کی خواہش تو یہی ہے کہ ایک ہی عورت ماں کے فرائض بھی انجام دے۔ بیوی کے بھی اور دلربا کے بھی اس خیال کے آتے ہی میں تمنائی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط میں میں نے لکھا کہ میری شادی کو کچھ اوپر تین سال ہو گئے اب ایک بچی کی ماں ہوں۔ میرے شوہر کو بھی مجھ سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کے بعد میں نے عورتوں کی مردوں سے غلط توقعات کی وضاحت کی۔ مردوں کے جور و تشدد کی مثالیں پیش کیں اور ان سے دریافت کیا کہ مسز تمنائی پر کہیں ان کی طرف سے تو زیادتی نہیں ہو رہی۔ آخر میں مسز تمنائی کے مفصل حالات لکھنے کی استدعا کی اور اپنے مضمون کی تعریف کا شکریہ ادا کیا۔

خط اسی دن لکھ کر ڈلوا دیا۔ چار دن بعد جواب آیا جس میں میرے خط کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:۔

"——— تمہارا خط دیکھ کر مجھے تسلیم کر لینا پڑا کہ مرد فی الحقیقت

جابر و ظالم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ میری طرف سے زیادتی ہوئی۔ تمہارے خط نے میری آنکھوں پر سے خود غرضی اور نفس پرستی کے پردے اٹھا دئے۔ ثریا تم میرے لئے نیکی کا فرشتہ ہو۔

میری بھی ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ جو نہیں جانتی کہ باپ کی محبت کسے کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس بچی ہی کو ان تمام بدمزگیوں کا سبب ٹھیرا تا تھا جو ہم میاں بیوی میں پیدا ہو گئی ہیں مگر اب سے آئندہ اس کا باپ اس سے محبت کرے گا اور اسی کی خاطر اس سے بھی محبت کرے گا۔

مسز تنائی سے شادی بربنائے محبت ہوئی تھی۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ وہ کیسی ہوں گی۔ مجھے یہ سن کر بیحد رنج ہوا کہ تمہارے شوہر تم سے شاکی ہیں۔ اتنی سمجھ دار عورت سے اگر مجھے شکایت پیدا ہو تو میں اسے اپنی غلطی سمجھوں گا۔ کیا میں تم سے پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ انھیں تم سے کس نوع کی شکایات ہیں ———— ؟"

خط کا جواب میں نے لکھ دیا۔ اس میں اشرف صاحب کی ناراضگی کا سبب بھی لکھ دیا کہ محض اس لئے کشیدہ خاطر ہیں کہ میں ایک بیمار بچی کی ماں کیوں بن گئی۔ چند اور رسمی باتیں لکھ کر خط ختم کر دیا۔

شام کو بلقیس آئی تو کہنے لگی" تمھیں آئے ہوئے خاصے دن ہو گئے ننھی بھی اب اسا نوٹ ہو گئی ہے یہاں زیادہ دنوں ٹھیرنا ٹھیک نہیں"

میں نے کہا" ہاں میں تو خود جانے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ کل شام

کو چلی جاؤں گی ۔ دیکھئے اب آئندہ کیا رہتی ہے اور وہاں دیکھنا اگر میرا کوئی خط آئے تو پتہ کاٹ کر میرٹھ بھیجدینا ۔"

اس نے پوچھا "کس کا خط آنے والا ہے ؟" میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ تمنائی سے پھر خط وکتابت ہو رہی ہے ۔

میں نے کہا " شاید کسی کا آئے ۔"

اس نے کہا " خطوط تو میں سب بھیجدوں گی پہلے تو نکل یہاں سے ۔"

دوسرے دن شام کو میں میرٹھ روانہ ہو گئی ۔ اشرف صاحب کو میرے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی ۔ خاصی رات گئے کلب سے واپس آئے تو مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے ۔ رات کو ایک آدھ بات کی ۔ صبح کو بھی چند غیر ضروری باتیں ہوتی رہیں ۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ ملازمہ نے ڈاک لاکر دی ۔ اشرف صاحب نے ایک ایک کر کے خطوط دیکھنے شروع کئے ۔ ایک گلابی لفافہ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کیونکہ پتہ کی بناء پر تحریر کو میں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا ۔ یہ وہ خط تھا جو پرسوں میں نے تمنائی کو لکھا تھا ۔ میں نے بے اختیارانہ ایک دم سے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا اشرف صاحب کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔ انھوں نے کہا " وہ خط میرا ہے مجھے دو ۔"

میں نے کہا " نہیں میرا ہے ۔ اس میں کچھ خانگی باتیں ہیں اس لئے آپ کو نہیں دکھا سکتی ۔"

انھوں نے کہا ۔" وہ خط تمنائی کے نام ہے ۔ تمہارا نام تو تمنائی نہیں ہے ۔"

میں نے جلدی سے پوچھا " اور کس کا نام ہے ؟ "

" انھوں نے کہا " میرا قلمی نام ہے ۔"

میرے ہاتھ سے خط گر پڑا۔

"آپ تمنائی ہیں؟" میں نے استعجاب سے کہا۔

"ہاں، کیا تم اس نام سے واقف ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

میں نے ان کے سوال کا جواب ایک اور سوال سے دیا "کیا آپ ثریا سے واقف ہیں؟"

وہ یہ نام سن کر ہو چکے سے رہ گئے "ثریا ——— تمہیں اس کے متعلق کیا معلوم ہے" انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں ثریا سے اسی قدر واقف ہوں جس قدر کہ اپنے آپ سے کہ ثریا میرا قلمی نام ہے"۔

ان کے چہرے پر حیرت و انبساط کے مخلوط آثار نمایاں ہوئے۔ "تم، تم ثریا ہو؟ حسنیٰ کیا تم ثریا ہو؟ اچھا تو بتاؤ اس خط کا مضمون کیا ہے؟" انھوں نے خط کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں نے خط کا سارا مضمون انھیں بتا دیا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھے مجھے تکتے رہے۔ پھر اٹھ کر میرے قریب آئے اور کہنے لگے "حسنیٰ گذشتہ سب باتوں کو بھول جاؤ۔ تم نے اپنے خطوں میں مجھے میری کمزوریوں سے آگاہ کر دیا۔ میں انکے اصلاح کرنیکی کوشش کروں گا یہاں سے ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب سے ہم تمنائی اور ثریا کی تخیلی زندگی کی لطیف رنگینیوں کو اشرف اور حسنیٰ کی عملی زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش کریں گے"۔

ہماری آنکھوں میں ایک نئی زندگی چمک رہی تھی اور اس معاہدے پر ایک طویل بوسے کی مہر ثبت کی جا رہی تھی۔

شاہد احمد، بی اے (آنرز) دہلوی

خواب

(اور)

اُس کی تعبیر

اگرچہ چندی آنکھوں، دبیز عینک اور طول طویل ناک کے باوجود کوئی شخص معقول ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو اقبال المعروف بہ صحرائی بلگرامی حال مقیم الٰہ آباد پیشہ لکچرار لارنس کالج الٰہ آباد ہر طرح معقولیت کا مجسمہ کہلانے جانے کا مستحق تھا۔ خوش اخلاق و خوش اطوار، خوش گفتار، خوش حال اور خوش پوشاک ہونے کے ساتھ ہی وہ خوش خور بھی تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ بریانی اور متنجن کی تین تین لبریز قابیں چٹ کر جانا اس کا معمول تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرصت اور فراغت کے لمحات میں نئے نئے کھانے ایجاد کرنا اس کا محبوب ترین شغل تھا۔ بہرکیف اس کمزوری کو دور کرنے کے بعد وہ ہر طرح ایک دلچسپ آدمی تھا۔ لائق، فائق غور و فکر کا عادی۔ اچھا شاعر اور

انشا پرداز، ہندوستان میں معاشیات کے ایک انوکھے تنظیمی پروگرام کا مجدد، جریدہ "نوبہار" کا مستقل نامہ نگار، تنہائی پسند ہوائی قلعوں کا معمار، بے انتہا سگریٹ پینے والا۔ ذکی الحس، فطرتاً رومان پسند لیکن عادتاً بزدل، کم ہمت اور خائف۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن ایک غیر متعارف خاتون کے بنفشی رنگ کے معنبر و معطر خط نے اس کے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا۔ بے تکلف طرزِ خطابت اور غیر معمولی لگاوٹ آمیز لہجہ نے اس کے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ اس کی ۲۸ سالہ عمر میں یہ پہلا خط تھا جو کسی عورت نے اسے لکھا ہو۔ اور وہ بھی اس قسم کا!

جس وقت کالج کے چپراسی نے یہ خط اسے دیا وہ درس و تدریس سے فراغت پانے کے بعد لائبریری میں بیٹھا تھا۔ خط پر سرسری نظر ڈالتے ہی اس کا سر چکرانے لگا۔ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ کالج کے پوشیدہ ترین گوشہ میں پہنچا۔ کئی سگریٹ ختم کرنے کے بعد وہ باطمینان اس خط کو پڑھ سکا۔ ایک بار دو بار۔ کئی ہزار بار۔ بنفشی رنگ کے کاغذ پر لاجوردی روشنائی سے بہترین خطاطی کی گئی تھی۔ اقبال جب خط پر نظر ڈالتا اسے ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نازک اندام حسینہ لاجوردی بنفشی رنگوں میں ملبوس عطر میں ڈوبی، صاف و دلکش آواز میں اس سے یوں سرگرم اختلاط ہے:

میرے محترم صحرائی!

سلام شوق! اپنی اس جرأت کی معافی چاہتے ہوئے میں ان خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں جو آپ کی زندۂ جاوید نظم بہ عنوان "خیالی پریتم!" پڑھنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں "نوبہار" کی قدیم خریدار ہوں، اور آپ کے افکار کا خاص طور سے مطالعہ کرتی ہوں

آپ کے نثر کے مضامین، مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے میری سمجھ سے باہر ہیں لیکن آپ کے اشعار مجھ پر جادو کا اثر کرتے ہیں خصوصاً آپ کی "تازہ نظم" خیالی پریتم سے!" نے تو مجھے نہ معلوم کہاں پہنچا دیا۔ شاید آکاش پر، دمکتے ستاروں کے پاس!

باور کیجیے کہ آپ کی نشیلی نظم میں نے ہزاروں مرتبہ گائی اور ہر مرتبہ ایک نئی لذت حاصل کی ایک ایک لفظ میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ آپ کے اعلیٰ جذبات پرستش کے لائق ہیں۔ لیکن ہزار افسوس کہ ان کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔ میری وارفتگی ملاحظہ ہو کہ جس طرح میں آپ کے پاکیزہ جذبات اور انوکھے خیالات کی دیوانی ہو رہی ہوں چاہتی ہوں کہ سب اسی طرح دیوانے ہو جائیں۔ کم از کم آپکے اشعار کا مطالبہ تو یہی ہوتا ہے مجھے فرض کر لینے دیجیے کہ آپ کی پیاری نظم کا ایک ایک لفظ آپ کی دلی کیفیات کا مرقع ہے اگر یہ سچ ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ کو صرف شاعر ہی سمجھوں یا پریم کا سب سے بڑا دیوتا! جس کی موہن مرلی نے پریت کے سہانے گیت سنا کر مجھے عرصہ سے والہ و شیدا بنا رکھا ہے میرا پر شوق دل آج اس حقیقت کا انکشاف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عرصہ سے میں آپ کو اپنا معبود خیال تصور کرتی ہوں۔ ساتھ ہی مجھے معاف کیجیئگا اگر میں یہ دریافت کروں کہ عشق کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے گیت جو آپ سنایا کرتے ہیں ان کا محرک کون ہے؟ سوز و گداز سے لبریز نغموں کے عقب مجھے ایک ایسا چاند نظر آتا ہے جس نے آپ کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا ہے۔ کیوں؟ مجھے یہ سب

کچھ نہ لکھنا چاہیئے تھا۔ لیکن آپ کی لوح دل پر نقش ہو جانے والی نظم نے میرے پُر ارمان دل میں شوق کی چنگاریاں بھر دیں اور میں ضبط نہ کر سکی۔ خدا نہ کرے جو یہ چند سطور آپ کی ناگواری کا باعث ہوں۔

ہمیشہ آپ کی "..........."

اقبال نے سینکڑوں مرتبہ لفافہ کو گھور گھور کر دیکھا۔ کیا یہ خط اسی کے نام ہے۔ "صحرائی صاحب معرفت ایڈیٹر" نو بہار" کان پور" کو کاٹ کر ایڈیٹر نے اپنے قلم سے کالج کا پتہ لکھ دیا تھا۔ پھر بھی اسے کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ کاتب خط نے اپنا نام نہیں لکھا تھا بلکہ خط سے ہم رشتہ ایک لفافہ پر" س ش معرفت پوسٹ ماسٹر صاحب لکھنؤ" لکھا ہوا تھا۔ لفافہ پر ٹکٹ بھی چسپاں تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فوری جواب مطلوب ہے۔ گھر آنے پر اقبال نے خط کے مضمون کو بار بار اپنے دماغ میں دوہرایا۔ ہر ہر لفظ پر غور کیا۔ کئی گھنٹے تک اس کا دماغ لالہ زار رومانی وادیوں میں گشت کرتا رہا۔ لاجوردی اور بنفشئی رنگ اس کی آنکھوں میں کھبے ہوئے تھے۔ جوہی اور چمپا کی مخلوط مہک نے اس کے دماغ پر ایک نشیلی کیفیت طاری کر دی تھی۔ پر ارمان خوابوں کے جھمگھٹ میں اسے ہر چیز رنگین نظر آئی تھی۔ ایک سراپا حسن دوشیزہ قوس قزح کی مالا پہنے مشک وعنبر برساتی اس کے افق خیال پر نمودار ہوئی اور اس کے دل کی دنیا جگمگا اٹھی۔

"لیکن ممکن ہے یہ مذاق ہو"! اقبال اس کے ساتھ ہی چونک پڑا۔ "قطعی یہ صرف مذاق ہی ہو سکتا ہے کسی گدھے نے مجھے اپنا باپ بنانے کے لئے یہ جال بچھایا ہے۔ ہوں! تاکہ میں اس خط میں اپنا دل نکال کر رکھ دوں اور پھر وہ نالائق کلب میں میرے خط کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے .... آہا ہا

تم نے یہ خط دیکھا؟ قہ قہ قہ۔ پیاری حسینہ! عزیز از جان! از غیبی حور! اہا ہا ہا محبت ابدی محبت نہیں، عشق، جناتی عشق، چکور چاند، کلی اور بھونرا، شمع اور پروانہ ہیں اور تم! قہ قہ قہ۔ کیا تم! پیاری تم۔ آہ! درد۔ محبت۔ دل۔ نغمہ حسن۔ عشق۔ کیف۔ سرور۔ جنت۔ دوزخ۔ اہاہاہا۔ دیکھو، دیکھو۔ او ہو ہو ہو۔ عاشق زار اقبال۔ بچاری اقبال۔ بیوقوف۔ گدہا۔ ہاہاہا.......“

لیکن اس خط میں کچھ ایسی بات تھی کہ اقبال نے تہیہ کر ہی لیا کہ وہ اس کا جواب ضرور دے گا۔ عمر بھر میں ایک تو موقعہ ایسا ملا تھا جس سے وہ اپنی رومانی آرزوؤں کی کسی حد تک تکمیل کر سکتا۔ پھر ایسے زریں موقعہ کو احباب کے تمسخر کے ڈر سے کھو بیٹھنا ہمیشہ کی محرومی کے مترادف تھا۔ اس لئے اس نے ہمت کر ہی لی اور کچھ نہ سہی کم از کم جھوٹ سچ تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ چنانچہ کئی سگریٹ پینے کے بعد وہ لکھنے بیٹھا رات گئے ۱۵ ورق کا ایک مسودہ تیار ہوا جس میں نظر ثانی کے بعد تین صفحے اور بڑھے مضمون کیا تھا؟ فلسفہ حیات انسانی سرشت ادب، وانشا، اردو شاعری کا مستقبل، کساد بازاری، اقتصادیات، جہد للبقا حکومت اور انقلاب مکمل سوراج بذریعہ بغاوت، ایک مکمل دستور اساسی کا فقدان وغیرہ وغیرہ پر ایک ژولیدہ تبصرہ اور آخری تین صفحوں میں آہ و بکا کے درمیان پر زور اظہار عشق!!!

توبہ! یہ میں کیا لکھ گیا۔ استغفراللہ۔ معاذاللہ۔ ماشاءاللہ۔ شہ شہ شہ! ہزار نفریں کے بعد اقبال نے اپنی گھنٹوں کی محنت کو نذر آتش کیا اور پھر لکھنے بیٹھ گیا۔ صبح ہوتے ایک مسلم رائٹنگ پیڈ ضائع کرنے کے بعد یہ خط تیار ہوا:-

”محترم خاتون!

آپ کا پاکیزہ خط ایسی حالت میں موصول ہوا جب کہ میں عرصہ سے صاحب فراش ہوں مسلسل علالت نے دل ودماغ کو ماؤف کر رکھا ہے حواس زائل ہو چکے۔ زندگی کی کوئی امید باقی نہیں۔ ایسی حالت میں حیران ہوں کہ آپ کے عمدہ خط کا کیا جواب دوں۔

یہ کہنا سراسر الزام ہوگا کہ آپ نے میری تعریف میں حد درجہ غلو سے کام لیا۔ اس لئے کہ آپ کی تعریف نے فی الواقع مجھے مغرور بنا دیا۔ البتہ اتنا کہہ دینے میں کوئی ہرج نہیں کہ آپنے جن بڑی بڑی صفات سے مجھے متصف کیا ہے وہ جائز نہیں بظاہر آپ کی مبالغہ آمیز توصیف پر صرف آپ کا بڑھا ہوا حسن عقیدت ہے اور بس۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ آپ میرے ہیچ میرز افکار سے محظوظ ہوتی ہیں اور ان کی قدر کرتی ہیں۔ میں اپنی اس خوش قسمتی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا گلہ بھی ہے کہ میں اپنی لائق قدردان کے نام نامی سے بھی آگاہ نہ ہوسکا۔ بطور احتجاج میں بھی اپنا اصل نام نہ ظاہر کروں گا۔

میرے اشعار کے متعلق آپ کا استفسار یقیناً دلچسپ ہے جواب دیتے اس لئے ڈرتا ہوں کہ اس سے میری کمزوریوں کی غمازی ہوگی جس جذبہ کے ماتحت میرے اشعار موزوں ہوتے ہیں۔ اس سے میں خود بھی اچھی طرح واقف نہیں۔ رہا محرک والاقفیہ سو اس کا اظہار اور اغماض دونوں میرے عیوب کو ظاہر کرینگے

اس لئے اپنی سلامتی اسی میں سمجھتا ہوں کہ چپ رہوں - آپ کے اشتیاق و اصرار پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا ۔

تو مپندار کہ ایں زمزمۂ سازے ہست
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

میں ایک الم نصیب مایوس محبت ہوں اور بس - لیکن للہ میری روح کے اس تار کو نہ چھیڑئے گا - اس سے نشیلے گیتوں کی بجائے ایسے دل خراش نالے بلند ہوں گے جنھیں آپکے طرب آشنا کان کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے - نہ کبھی آئندہ مجھے اس امر کے اظہار پر مجبور کیجیئے گا - یہ میری ملتجیانہ درخواست ہے میں شرمندہ ہوں کہ اپنی علالت کے سبب فی الحال زیادہ نہیں لکھ سکتا - امید کہ آپ معاف فرمائیں گی - آئندہ مجھے اس پتہ پر خط لکھیئے گا - صحرائی معرفت پوسٹ ماسٹر الہ آباد - آپ کی محبت بھری توصیف کا ہزار بار شکریہ - والسلام

آپ کا
صحرائی

جس بے چینی سے سندباد جہازی اس وقت کا منتظر تھا جب کہ وہ نالائق تسمہ پا سے نجات حاصل کر کے اپنے وطن واپس آجائے، اتنی ہی بے چینی سے اقبال نامعلوم حسینہ کے جواب کا انتظار کر رہا تھا - اس کی دماغی کیفیات اور ان ہوائی قلعوں پر تبصرہ کرنا جو وہ اب تک ہزاروں مرتبہ بگاڑ کر بنا چکا تھا، الف لیلہ کے دہرانے کے برابر ہے - ہفتہ میں پچیس ہزار مرتبہ اس نے ملازم کو ڈاک خانہ

بھیجا اور پچاس ہزار مرتبہ اسے مایوس ہونا پڑا۔ ایک روشن صبح جب کہ وہ رات دیر تک جاگنے کے سبب سو رہا تھا اس کی نیند سے بھری مُندی ہی آنکھوں نے چونک کر بنفشہ و لاجورد کا خواب دیکھا۔ ملازم اس کے مرتعش ہاتھوں میں لفافہ دے کر چلتا ہوا۔ وہی خوب صورت خط! چمپا اور جوہی کی مخلوط خوشبو تھی اور بنفشہ زار پر لاجورد موتی بکھرے پڑے تھے۔ سگریٹ پیتے ہوئے وہ غسل خانہ میں گھس گیا اور یہ اطمینان کر کے کہ اب کوئی مخل نہ ہوگا اس نے خط کو حفظ کرنا شروع کیا۔

"میرے دیوتا صحرائی!

خط ملا۔۔۔۔ بہت سا شکریہ۔ آپ کی علالت کی خبر سن کر دلی صدمہ ہوا۔ خدا جلد ہی صحت عطا کرے۔ میں ہمہ وقت دست بدعا ہوں میں نے دانستہ طور پر اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا اس لئے کہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ اب چونکہ آپ مصر ہیں اور بظاہر ہماری خط و کتابت کے جاری رہنے کے آثار بھی ہیں اس لئے ایک دوسرے کا نام معلوم ہونا ضروری سا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اصلیت ہمیشہ رومان کا خون کر دیتی ہے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ خود ہی میرے لئے کوئی نام تجویز کریں۔ ایسا نام جو ازحد رومانی ہو اور آپ کو پسند بھی ہو۔ میں آپ کو اپنے متعلق کچھ بھی نہ بتاؤں گی اور نہ آپ بتایئے یہ اس لئے کہ میں چاہتی ہوں کہ یہ پر لطف اور دلچسپ مذاق صرف مذاق ہی رہے اور کوئی اور صورت اختیار نہ کرے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ میں اس سہانے رومان میں بھیانک اصلیت کے شائبہ کو بھی دخل دینا نہیں چاہتی ہم ایک دوسرے کے لئے صرف ایک

دلآویز اسرار ہی رہیں تو شاید اپنی اپنی زندگیوں کی بدمزگیوں اور تلخیوں کی اپنے رومانی خوابوں کے ذریعہ ایک حد تک تلافی کر سکینگے یقین ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ آپ نے محبت کے عوض مایوسی مول لی لیکن آپ رنج و غم سے اس قدر دل برداشتہ کیوں ہیں۔ یہی تو اصل چیزیں ہیں روح کو اجالنے والی۔ انسان کے اصل جوہر کو ابھارنے والی۔ شاعر کی آواز میں درد پیدا کرنے والی۔ البتہ محبت کے عوض یہ چیزیں مہنگی ہیں۔ آپ کے اصرار نے کہ میں کبھی بھی اس کے متعلق آپ سے استفسار نہ کروں مجھ میں اور بھی اشتیاق پیدا کر دیا۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کی روداد محبت آپ ہی کی زبانی سنوں۔ لیکن مجبور ہوں۔

آج میری مسرت کا ٹھکانا نہیں کہ اس ادیب شخصیت کا خط میرے پاس آیا جس نے عرصہ سے میرے خیالوں کی دنیا آباد کر رکھی تھی میں خوش ہوں بہت خوش! دنیا کی ہر چیز میرے مسرور نغموں سے ہم آہنگ ہے آج پریم دیوتا کے مقدس دربار میں مجھ حقیر داسی کو باریابی حاصل ہو گئی۔

اس ازلی پریمی نے جو روحوں میں گونجنے والے عشق کے اداس گیت گایا کرتا ہے مجھ پریم بھکارن کی آواز سن لی۔ میرا ارمانوں سے بھرا دل خوشی کے سمندر میں تیر رہا ہے میں کس قدر خوش نصیب ہوں۔ اوہ ——— !

آپ میری غیر معمولی بے تکلفی کو معاف فرمائیں۔ میں ایک جانفزا

رومان کے لئے تڑپتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو اکمل طریقے پر پوری ہوئی۔ اسی لئے میں اس رومان کی پراسرار نوعیت سے ضرورت سے زیادہ متاثر ہوں۔

خدا کرے میں جلد ہی یہ سن لوں کہ آپ بالکل تندرست ہیں۔ زیادہ محبت محبت محبت!

آپ کی ——— جو آپ کہیں"

غسل خانہ میں بند ہوئے اقبال کو کئی گھنٹے گذر گئے۔ ملازم پریشان تھے کہ آخر ہوا کیا۔ جب نوبت کواڑ توڑنے تک پہنچی تو حضرت مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اس دن کالج جانا سراسر حماقت تھی۔ سارا دن اسی خط کے خمار میں صرف ہوا۔ لیکن اب بھی اسے کسی ستم ظریف کی چال کا گمان ہوتا رہا اور بار بار اس کے کانوں میں احباب کے تضحیک آمیز قہقہے گونج گئے۔ لیکن اپنے دل کو ڈھارس دے وہ اس سمندر میں سر کے بل غوطہ لگانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ رات گئے حضرت نے کئی گھنٹے کی محنت کے بعد یہ خط لکھا:۔

"شانتی!

تمہارا حیات افروز خط موصول ہوا۔ میں اپنی خوش نصیبی کا کچھ کچھ قائل ہو چلا ہوں۔ یقین جانا جس طرح تم اپنی بے رنگ زندگی سے تنگ آکر رومانی فضا کی متلاشی تھیں۔ اسی طرح میں بھی مسلسل سکون سے اکتا کر روح کو گدگدانے والا اضطراب ڈھونڈتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں کی آرزو پوری ہوئی اور وہ بھی بقول تمہارے "بطریقہ اکمل"! میں نے تمہارا نام "شانتی" تجویز کیا ہے۔ جس کی کئی وجوہ ہیں ایک یہ کہ مجھے یہ نام پسند ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ دوسرے یہ کہ

شانتی (سکون و آرام) دنیا والوں کو باوجود عرق ریز جد و جہد کبھی نہیں مل سکتی اور میں بھی اپنے محبوب کو اپنے لئے "ناقابل حصول" سمجھتا ہوں صرف اس کا تصور ہی میری سست نبض میں زندگی کی لہر دوڑا نے کے لئے کافی ہے۔ تیسرے یہ کہ ہندی شاعری میں اقدام محبت ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور موجودہ صورت میں بھی اقدام کا سہرا تمہارے ہی سر نظر آتا ہے۔ (یہ میں الزاماً نہیں کہتا) اس لئے یوں بھی میں ایک ہندی نام تجویز کرتا چونکہ یہ کہ تم نے اپنے آپ کو اب تک "س" کی حیثیت سے ظاہر کیا جو شاید تمہارے نام کا اصل جزو ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ "س" سے شروع ہونے والا نام... "شانتی" کیوں نہ ہو۔ غرض مجھے "شانتی" نام ہر طرح رومانی معلوم ہوا۔ اس کے تلفظ ہی سے شیرینی ٹپکتی ہے، تمہاری کیا رائے ہے؟ میں اگر تمہارے پاکیزہ مذاق اور شائستہ انداز تحریر کی تعریف کروں تو اسے خوشامد پر محمول نہ کرنا۔ حق یہ ہے کہ میں تمہارے اعلیٰ مذاق اور پسندیدہ جذبات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میری "روداد محبت" کے متعلق تمہارے لطیف کنائے مجھے بہت پسند آئے۔ اس داستان پارینہ کے دل خراش دفتر دوہرانے کی بجائے میں تجدید کو بہتر سمجھتا ہوں اس لئے کتنا اچھا ہوا کہ تم — یعنی ایک حسین خواب — میرے ارمانوں کا مرکز بن گئیں۔ میرے خون کا ہر قطرہ نئے سرے سے شراب ناب میں تبدیل ہو گیا۔ میرے دل کی ہر چیز از سر نو جگمگا اٹھی۔ آرزوؤں اور ارمانوں کے جامد و ساکن سمندر میں امید اور شوق کی سبک رَو موجوں نے پھر ایک نرم تلاطم

برپا کر دیا۔ ممکن تاریخ میں پہ یت کی جھلملاتی شمع پھر نمودار ہوئی۔ پژمردہ حسرتیں جو ناکامی کے سوگوار دامن میں منہ چھپائے خدا معلوم کب سے بے حس پڑی تھیں۔ نئے سرے سے بیدار ہوگئیں اور میرا دل پھر کسی کے پریم بھجن گانے لگا۔

——— آہ! ہماری دنیا کتنی عجیب ہے۔ رنگین و دلآویز تخیلات کی دنیا عالم اسباب کی سرحدوں سے کوسوں دور، جہاں صرف میں اور تم ہیں اور وہ بھی جسمانی قیود سے آزاد، صرف تخیل کی صورت میں ——— خدا کرے یہ حسین طلسم کبھی نہ ٹوٹے۔

اس خط میں تم دیکھو گی کہ میں نے آپ اور جناب کی ریاکاری کو توڑ کر زیادہ بے تکلف بننے کی کوشش کی ہے توقع ہے کہ تم بھی اسے پسند کرو گی۔ میں اب اچھا ہوں۔ بالکل تندرست البتہ فرصت کم ہوتی ہے۔

باقی ——— باقی

تمہارا ——— صحرائی"

شانتی نے یہ نام بہت پسند کیا۔ شانتی واقعی حد درجہ باکیف نام ہے میں اس نام سے منسوب ہوکر اپنے آپ میں ایک عجیب و غریب تبدیلی محسوس کرتی ہوں"

اس کے بعد صحرائی اور شانتی کے خطوط نے عشق اور جنون کی صورت اختیار کرلی۔ اقبال کی ذہنیت پہ اس پراسرار رومان نے خاطر خواہ اثر کیا وہ اب عطریات کی کثیر مقدار استعمال کرنے لگا۔ گانا سیکھنے کی بھی کوشش کی ظاہری نمائش میں بھی ضرورت سے زیادہ ترقی کی۔ عام طور پہ بشاشت اور

جولاں نظر آتا۔ لیکن تنہائی کا معمول سے زیادہ دلدادہ ہو گیا اکثر اوقات تخیل کی نگری میں گم رہتا۔ اور آپ ہی آپ عجیب عجیب حرکتیں کرتا۔ اس کے اشعار میں بھی اب اداسی۔ مایوسی۔ ناکامی کی چاشنی نہ رہی۔ بلکہ "تمنائے وصل" اور فراق کی کڑیوں کے گلے نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔

ہر چوتھے دن ایک خط آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ شانتی کے خطوط زیادہ پر زور اور غضب ناک ہوتے تھے۔ وہ ایک محفوظ و مامون فاصلہ پر بیٹھی اقبال کے ان احساسات سے کھیلا کرتی تھی جن کا بیدار ہو جانا خالی از خطر نہیں ہوتا اور خود بھی اپنے لطیف سے لطیف جذبے کو ظاہر کرنے سے ذرا نہ جھجکتی تھی تا اس قدر کہ بعض اوقات اقبال جیسے کم ہمت اور ڈرپوک انسان کو بھی پھریری آجاتی اور اکثر اسے رنج ہوتا کہ کیوں نہ وہ ایک دوسرے سے لیں۔ اس کے خطوں میں بھی اب زیادہ زور اس بات پر ہوتا۔

"...... میرے ارمانوں کی تشنگی اب صرف تمہارے تخیل ہی سے سیراب نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں خیالی دھندلکے سے نکل کر اب اپنا اصلی روپ ظاہر کر دیں۔ یقین جانا مجھ میں اب ضبط کی طاقت نہیں۔ ان رومانی خوابوں سے اب مجھے بے چینی اور الجھن ہونے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان لاج بھری نشیلی آنکھوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں جن میں میرے لئے پریم کا دریا لہریں لے رہا ہے۔

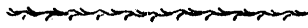
اس پاک دل کی تیز دھڑکن اپنے کانوں سے سنوں جس میں میرے لئے محبت کا سرچشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ غرض یہ کہ میں تم سے ملنے کے لئے تڑپتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں کسی تمنا کی تکمیل چاہتا

ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ ان رنگین بہاروں، کیف آور کجلی بن گھٹاؤں، پھولوں کی مست خوشبوؤں اور چندر ماں کی شفاف دودھیائی چاندنی میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے لئے چند محسوس معنی پیدا ہو جائیں اور بس ——— شانتی تصور کرو کہ ہیں تمہارے حسین قدموں میں آنسوؤں کی سرگرم رو میں یہ درخواست کر رہا ہوں کیا تم مجھے ٹھکرا دو گی ...."

لیکن شانتی اپنے رومانی سمندر میں غرق تھی اور رہنا چاہتی تھی۔ یقیناً اس کے دل میں بھی ولولے اور امنگیں پیدا ہوتی تھیں، شوق اور آرزوؤں کی گھٹائیں چھاتی تھیں لیکن اس میں "عمل" کی ہمت نہ تھی۔ محبت، اسرار اور رومان کا تصور ہی اس کی معصوم نبض میں چنگاریاں بھر دیتا تھا اور یہ کافی سے زیادہ تھا۔ اسی سے اس کے شوق کی تسکین ہو جاتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دلبستگی کے عملی سامان قطعی ناممکن الحصول ہیں۔ پھر مکمل ناامیدی سے تو یہ لفظی اور خیالی رومان بہرحال بہتر تھا۔ چنانچہ اس نے لکھا:-

"........ نہیں عزیز ترین صحرائی! یہ ناممکن ہے ہمیں کبھی بھی نہ ملنا چاہیئے۔ ہمارا ایک دوسرے سے ملنا اس سرور انگیز طلسم کی شکست کے برابر ہے۔ پھر کیا تم اسے پسند کرو گے کہ "شانتی" تمہارے اعلیٰ تخیل کی پیاری اور رومانی تخلیق ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔ تمہاری شانتی مجھ سے ہزار درجہ افضل ہے۔ وہ ایک فردوسی ہستی ہے جو تمہارے خیالی محلوں میں رہتی بستی ہے تم مجھ سے مل سکتے ہو لیکن اپنی شانتی کو کبھی نہیں پا سکتے اور آہ! یہ آخری چیز ہو گی جسے میں کسی طرح بھی پسند کروں کہ تم مجھے شانتی کی بجائے کچھ

اور سمجھو۔ میں تمہاری نظر میں ہمیشہ شانتی ہی رہنا چاہتی ہوں۔ اس لیے عزیز صحرائی خدارا اس خیال کو دل سے نکال دو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"



ایک برس گذر گیا صحرائی اور شانتی کی جوشیلی خط وکتابت جاری رہی، اقبال نے پھر کبھی شانتی سے ملنے کی درخواست نہ کی، اس طرف سے وہ قریب قریب ناامید ہو چکا تھا۔ لیکن ان کی رومانی محبت کا شجر برابر پھولتا پھلتا رہا اور کبھی اصلیت کی بادِ سموم نے اسے نہیں مرجھایا۔ بنفشہ والا جوردی خطوط اب بھی اس پر وجدانی کیفیت طاری کر دیتے تھے، جوئی اور چمپائی مخلوط خوشبو اب بھی اس کے دماغ پر نشیلی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا۔ تا آنکہ اقبال کو اپنے معاشیات کے تنظیمی پروگرام کے سلسلے میں اچانک مشرقی بنگال جانا پڑا اور پھر وہاں سے چمبر لین انکوائری کمیٹی کے ساتھ بہار اور اڑیسہ کا دورہ بھی کرتا تھا۔ ہر چند اقبال کو یہ جدائی کسی طرح گوارا نہیں تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ دورے کی حالت میں بھی یہ رومانی خط وکتابت جاری رہتی۔ چنانچہ اس نے شانتی کو لکھا :۔

"عزیز شانتی !

اپنے دل پر پتھر رکھ کر آج میں تم کو کچھ عرصہ کے لیے "خدا حافظ" کہتا ہوں مجھے ایک اہم کام کے سلسلے میں کافی عرصہ تک دورہ پر رہنا ہے اور اس دوران میں ہماری خط وکتابت کا جاری رہنا مشکل نظر آتا ہے تمھیں بھی یہ جدائی شاق گذرے گی لیکن میں جلد ہی فارغ ہو جاؤں گا اور ہم پھر ایک دوسرے کے صادق خیالات سے اپنے دلوں کو روشن کر لیں گے۔ وہ رومانی چنگاریاں جو عرصہ

سے ہمارے دلوں میں روشن تھیں وقت کے ہاتھوں کجلا چکی ہیں اس لئے یہ وقتی فراق یوں بھی تجدید کا کام دے گا اور ہماری محبت کے شعلے پھر بھڑک اٹھیں گے۔ الوداع!

خدا کرے تم ہر طرح خیریت سے رہو۔ میں جلد ہی تمھیں خط لکھونگا اگر اس عرصہ میں مجھے تم کوئی پیغام پہنچانا چاہو تو "سن رائز" کے "پرسنل" کالم میں لکھ سکتی ہو۔ میں جہاں کہیں بھی ہوں گا ضرور اسے دیکھ لوں گا۔ ویسے تمہارا پیارا خیال ہر وقت میری روح کو گرماتا رہیگا الوداع!! بہت سے × × !!! یہ چند سطور عجلت میں لکھ سکا

ہمیشہ

تمہارا صحرائی"

ہر چند اقبال کچھ ایسا قریبی عزیز نہ تھا۔ لیکن یہ علی احمد صاحب کی وضعداری کے خلاف تھا کہ برسوں کے بعد تو اس سے ملنا ہوا اور اسے اپنے ہاں کچھ دن مہمان رہنے پر مجبور نہ کریں۔ اقبال بھی اپنا دورہ ختم کر چکا تھا اور ابھی چھٹیاں بہت سی باقی تھیں۔ اس لئے اس نے علی احمد صاحب کا (جنھیں وہ چچا جان کہتا تھا) حکم ماننا پڑا۔ یوں بھی وہ ایڈیٹر "نوبہار" اور دیگر احباب کان پور سے تفصیلی ملاقات کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس نے علی احمد صاحب کے ہاں تین چار روز ٹھہرنے کا وعدہ کر ہی لیا۔

لکھنؤ میں مسلسل آٹھ برس تک تعنیات رہنے کے بعد علی احمد صاحب (سب جج) کا حال ہی میں کان پور تبادلہ ہوا تھا۔ گو کان پور بھی ان کے لئے کوئی نئی جگہ نہ تھی لیکن لکھنؤ جیسی صحبتیں یہاں کب نصیب ہوتی تھیں اپنے طویل قیام کے سبب وہ لکھنؤ کے شریف تر حلقوں میں اس طرح گھل مل گئے

تھے کہ پردیس وطن سے بھی زیادہ عزیز ہوگیا تھا۔ شفیق احباب سے آٹھ برس کا ساتھ چھوٹنے پر انھیں قلبی رنج ہوا۔ آنے کو وہ کان پور آگئے لیکن لکھنؤ میں دوبارہ جانے کی برابر کوشش کر رہے تھے۔ اسباب بھی سارا لکھنؤ ہی چھوڑ آئے تھے اس لئے کہ دو ایک مہینہ میں پھر انھیں لکھنؤ جانے کا یقین تھا۔

گو بے سروسامانی تھی لیکن اقبال کی خاطر مدارات، آسائش اور آسودگی میں انھوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کوٹھی کا ایک وسیع و پر تکلف کمرہ اس کے لئے وقف کر دیا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز کے ساتھ تعیش کے سامان بڑے پیمانے پر مہیا تھے۔ تیسرے پہر کی چائے اقبال نے اپنے چچا جان کے ساتھ پی۔ معمولی گفت و شنید کے بعد وہ کچھ دوستوں سے ملنے کے لئے رخصت ہوا۔ علی احمد صاحب نے بار بار تاکیداً کہا "شام کو جلدی آنا تمہاری چچی اور بہن تم سے ملنے کی بہت مشتاق ہیں" چچی کے لفظ اور شخصیت میں جتنی جاذبیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے لیکن "بہن" کا مسئلہ واقعی غور طلب تھا۔ اقبال چلتے پھرتے بیٹھتے اٹھتے اسی پر غور کرتا رہا۔ بہن کا لفظ بار بار اس کے دماغ میں "جگنو" کی طرح چمکتا رہا۔ کبھی وہ ایک ننھی منی انگوٹھا چوسنے والی بہن کا تصور کرتا اور کبھی ایک طویل و عریض عورت دو تین بچوں کو ساتھ لئے اس کے سامنے آکر 'بہن' ہونے کا اعلان کرتی ان دو کے علاوہ اگر کوئی نقشہ اس کے ذہن میں آتا تو وہ صرف بنفشہ ولاجورد اور جوہی و چمپا کے سرور انگیز مرکب کا ایک نورانی مجسمہ ہوتا تھا، جوان رعنا اور حسن مجسم۔ شباب کے تصور کے ساتھ بنفشہ ولاجورد کے دلکش خواب آپ ہی آپ اس کے ذہن میں آجاتے تھے۔ دراصل اس کے تخیل کی معراج ہی یہ تھی۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی اور وہ تیز قدموں سے علی احمد کی کوٹھی میں داخل

ہوا سب سے پہلے اقبال کو جن صاحب سے متعارف کروایا گیا وہ مجسم حماقت کانڑے، "ک" کی جگہ "ق" بولنے والے مولوی شمس الدین صاحب تھے یہ مولوی صاحب جن کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوگی چچی کے میکے کے ایک غریب اور مفلوک الحال رشتہ دار کے نورِ نظر تھے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور چچا ان کے تمام اخراجات کے کفیل تھے۔ نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ ڈاڑھی رکھنے کا بھی ارمان تھا اسی وجہ سے سب انہیں مولوی صاحب کہتے تھے۔ خوشنویسی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ گانے کے بھی شوقین تھے۔ لیکن زیادہ تر نعت و مناجات گایا کرتے تھے۔ بلی سے بہت ڈرتے تھے۔ غرض ان کی بونگی شخصیت گھر والوں کے لئے ہمیشہ سامان دلبستگی فراہم کرتی رہتی تھی۔ اپنی عجیب و غریب حرکتوں سے سب کو ہنساتے رہتے تھے۔ بعض لوگ انہیں "مولوی کھلونا" بھی کہتے تھے منجملہ اور خوبیوں کے بڑا ہنر یہ تھا کہ ان کی "خوش مذاقی" کی داد اگر چانٹوں اور..... گھونسوں سے دی جاتی تو اور بھی خوش ہوتے دراصل اسی کو وہ اپنی قدر دانی اور ہمت افزائی سمجھتے تھے۔

چچی کو جیسا ہونا چاہیئے تھا ویسی ہی تھیں۔ لحیم شحیم، خوب گوری، پان کی دلدادہ ہنس مکھ، اچھے کپڑوں کی شوقین۔ ہزاروں دعاؤں کے ساتھ اقبال کا سلام لیا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ پان دیا۔ اور پھر بے سرو پا گفتگو شروع ہوئی:۔

"......... تم نے تو ماشاء اللہ خوب قد نکالا —— پہلے جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تمہاری عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی۔ تمہاری اماں میری بچپن کی سہیلی تھیں۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے، لاکھوں میں ایک عورت تھیں —— کب سے نوکر ہو —— کیا تنخواہ ملتی ہے

—— ولایت کیوں نہیں چلے جاتے —— شادی کب کرو گے
—— وغیرہ وغیرہ "

اقبال ہر سوال کا سوچ سوچ کر جواب دے رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں "بہن" کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بنفشہ ولاجورد کے سیکڑوں مجسمے اس کی نگاہوں کے سامنے بن بن کر بگڑے۔ چمپا دجوئی کی مست خوشبو اس کے دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ اچانک برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سرخ جارجٹ کی ایک بجلی سی کوندی اور فوراً ہی ہلکے سُرمئی پردوں میں روپوش ہوگئی۔ چچی نے ڈانٹ کر کہا "اے طلعت! آتی کیوں نہیں۔ اپنے بھائی اقبال سے ملو" کچھ پس وپیش کے بعد سرمئی پردوں میں جنبش ہوئی۔ ایک شعلہ جوالہ ایک رنگین صاعقہ سبک رفتاری سے بڑھا اور اقبال کا دل حلق کے پاس دھڑکتا معلوم ہوا۔ بوٹا سا قد نسی نویلی جوانی نے تناسب میں گدگداہٹ پیدا کر دی تھی۔ بھرے بھرے صبیح بازو آئینہ تمثال کافوری باہیں۔ حنا آلود شمعی انگلیوں سے ساری کا پلو سنبھالے۔ شرمگیں انداز میں چہرہ چھپائے، جھجکتی، شرماتی، لجاتی ہوئی آگے بڑھی اور ایک قیامت خیز لچک کے ساتھ خالص مشرقی انداز میں اقبال کو آداب کیا۔
اقبال گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور اس کے دل نے چِلّا کر کہا "شانتی!" لیکن اس کے کانوں میں "آداب" کی بانسری جیسے نشیلے سر ابھی تک گونج رہے تھے۔ اس پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ حسن بالذات ایک مسرت ہے۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ چچی بولیں "کل ہی ان کی دسویں میں پاس ہونے کی خبر آئی ہے" طلعت دوسرے صوفے پر بیٹھ چکی تھی اور اقبال مخبوط الحواس بنا ابھی تک کھڑا تھا۔ چچی کا فقرہ اس نے سنا ہی نہیں۔ بہت دیر بعد چچی پھر بولیں "بیٹھ جاؤ نا میاں اقبال کھڑے کیوں ہو" اقبال گویا خواب سے

چونکا۔ معذرت کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ لیکن اپنی حماقت پر دل ہی دل میں نادم تھا۔ کچھ دیر بعد مولانا کھلونے صاحب نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے اور سب کے سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

دوران طعام میں مولوی شمس کے بیڈھنگے لطیفے سب کو ہنساتے رہے علی احمد صاحب ان کی کھوپری پہ چمچے بجا رہے تھے اور وہ اور بھی خوش ہو ہو کر بندر کی سی حرکتیں کر رہے تھے۔ گو پر تکلف کھانوں کی افراط تھی اور اقبال کو اصولاً اس زرین موقع سے اپنی وسیع بساط بھر فائدہ اٹھانا چاہیے تھا لیکن اسے یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ کھا کیا رہا ہے۔ کیف و سکر کی حالت میں وہ نہ معلوم کہاں کھویا ہوا سا تھا۔ اب اسے پیٹ بھر کے "دیدار" نصیب ہوا۔ چاند سے مکھڑے پر حیات افروز بشاشت۔ بڑی بڑی مدھری آنکھوں میں زندگی کی تحریر۔ کمان جیسے ہلالی ابرو۔ گھنی پلکوں کا حسین سایہ نارنجی رخساروں پہ پڑ رہا تھا۔ پتلی ستواں ناک۔ ٹھوڑی کے قریب ایک جاں بخش سیاہ تل۔ چھوٹا سا دہانہ۔ پنکھڑی جیسے نازک لب جن سے مٹھاس ٹپکی پڑتی تھی۔ خوشنما بتیسی پر موتی کی سی آب۔ بلوری گردن میں موتیوں کی مالا جس کے وسط میں انگوری رنگ کا ایک بڑا سا موتی حلق کے نشیب (ڈگڈگی) میں پڑا خفیف سی ہنسی کے ساتھ تھرتھرا کر ایک عجیب عالم پیدا کر رہا تھا۔ اقبال برابر طلعت کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ اس کی طرف کنکھیوں سے بھی نظر کرتی تو اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی ہوش زائل ہو جاتے۔ بدحواسی کے عالم میں کوئی بے ڈھنگی سی حرکت کر بیٹھا۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی ایسے ہی موقعہ پر گھبراہٹ میں پوری نمک دانی فیرنی کی طشتری میں خالی کر لی جس پر سب نے خوب مذاق اڑایا۔ مولوی شمس کے ہنگام آفریں قہقہے کے عقب میں ایک

سریلی ہنسی اور سنائی دی جس سے اقبال کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔
خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور سب کے سب پائیں باغ کے چبوترے پر جا بیٹھے۔ طلعت نے نفاست و نزاکت سے پان پیش کئے۔ اب اقبال کی سراسیگی ذرا ذرا دور ہو چلی تھی۔ طلعت اس کے قریب ہی بیٹھی تھی اس کا دل تڑپ تڑپ کر اس حسن کی دیوی پر نثار ہو جانا چاہتا تھا۔ بارہا اس کا جی چاہا کہ اس مجسم شباب کے قدموں میں گر پڑے لیکن اس خیال کے آتے ہی اس کی روح کانپ گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نبضیں تیز ہو گئیں۔ تنفس کی رفتار دو چند ہو گئی۔ اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ مولوی شمس بولے:-
"آپا! بھائی جان تو وہ نیا ریکارڈ سناؤں۔ کیوں بھائی جان سنئے گا؟"
"قطعی" اقبال نے کھنکار کر کہا۔ مولانا گراموفون لانے دوڑ پڑے چچا اپنا حقہ اٹھا کر مردانہ میں پہنچے اور چچی نے اقبال کو ایک اور پان پیش کیا۔ باجہ آیا اور طلعت نے عمدہ عمدہ ریکارڈ چھانٹ کر یکے بعد دیگرے چڑھانے شروع کئے۔ ہر ریکارڈ کے ختم ہونے پر وہ اقبال سے دریافت کرتی کہ "کیوں بھائی جان! یہ کیسا رہا؟" اقبال کے پاس صرف ایک ہی جواب ہوتا کہ "بہت خوب" ایک دو دس بیس ریکارڈ بج گئے اور اقبال ہر ایک کے متعلق یہی کہتا رہا کہ "نہایت عمدہ۔ بہت خوب" طلعت نے جل کر کہا "معاف کیجئے گا بھائی جان مجھے اب تک آپ کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا معیار نہ معلوم ہو سکا۔" اقبال نے ہمت کر کے کہا "وہی جو آپ کا ہے" طلعت مسکرا دی اور اقبال اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوا۔ غرض بارہ بجے تک اسی قسم کی خوش گپیاں ہوتی رہیں اور باجہ بجتا رہا۔ اگر چچی اکتا نہ جاتیں تو

شاید طلعت ساری رات باجہ بجاتی رہتی اور اقبال ساری رات بیٹھا سنتا رہتا رات گئے سونے کی تیاریاں ہوئیں۔ طلعت نے اقبال کو آخری پان دیتے ہوئے کچھ اس رازدارانہ انداز میں "شب بخیر" کہا کہ اقبال ریشہ خطمی ہو گیا۔ دل حلق کے پاس دھڑکتا معلوم ہوا۔ ہڑبڑا کر اس نے "وعلیکم السلام کہہ دیا۔ طلعت نے ایک ہلکا سا نقرئی قہقہہ لگایا اور وہاں سے چلی گئی۔

بستر پر دراز ہو کر اقبال نے حالات کی نزاکت پر غور کرنا شروع کیا عمر میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ ایک سراپا حسن دوشیزہ کا اس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس طرح گھل مل کر باتیں کیں ہوں۔ طلعت کی سحر کار مسکراہٹ اس کے دل پر گہرا اثر کر چکی تھی۔ چاند سے مکھڑے کی ہزاروں دلکش ادائیں دل میں کھب گئی تھیں۔ طلعت واقعی حسین تھی لیکن حسین تو معمولی سا لفظ ہے سب ہی عورتیں اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں۔ طلعت میں کچھ باتیں ایسی تھیں جن سے اس میں امتیازی شان پیدا ہو گئی تھی۔ غرض گھنٹوں انہی خیالات میں رہنے کے بعد اقبال پر یہ حقیقت روشن ہو گئی تھی کہ اگر وہ دو ایک دن یہاں اور رہا تو اسے طلعت سے ضرور عشق ہو جائے گا۔ ایسا عشق جو شاید اس کی موت پر ختم ہو اور یہ اقبال کے لئے ایک دردناک اور قابلِ غور چیز تھی

رات بھر وہ طرح طرح کے سہانے خواب دیکھتا رہا۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دھانی رنگ کی ساڑھی میں لپٹی ایک حور اس کی میز پر گلدان میں پھول چن رہی ہے اور ہلکے سروں میں کچھ گنگنا بھی رہی ہے۔ بہت دیر تک اقبال یہ منظر دیکھتا رہا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اس دیوی کے سامنے سجدہ ریز ہو کر عرض مدعا کرے۔ لیکن اس ارادے کے ساتھ ہی اس کا سر چکرانے لگتا۔ جانکنی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اچانک دھانی رنگ کی ساڑی تیزی سے بڑھی

اقبال نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد پھر گنگنانے کی آواز آئی اور اقبال نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ طلعت انتہائی شغف کے ساتھ اس کی ٹوپی صاف کر رہی تھی۔ برش کی تیز حرکت کے ساتھ اس کے نازک آویزے کانپ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر غضب کا بانکپن تھا اور ایک شیریں مسکراہٹ نے تو کچھ اور ہی عالم پیدا کر دیا تھا اقبال دلچسپی سے اس کی حرکت پر غور کر رہا تھا۔ ٹوپی کو سلیقے سے رکھنے کے بعد اس نے ٹائی کو پریس میں رکھا۔ بہت دیر تک پیچ کستی رہی اور گنگناتی رہی۔ اس مرتبہ اقبال نے ہمت کر ہی لی اور اپنی آواز کو سر بلا بنانے کی ناکامیاب کوشش کرتے ہوئے کہا "طلعت!"

وہ ایک دم سے چونک پڑی۔ تیزی سے مڑی اور اپنے مخصوص قہقہے کے درمیان بولی۔ "اوہو! تو آپ جاگ رہے ہیں۔ معاف کیجئے گا میں مخل ہوئی۔ . . . ."

اور یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ چلتے وقت اس کی ساڑھی کا پلو اقبال کی طول طویل ناک پر پڑا اور اس کا دماغ معطر ہونے کے ساتھ ہی تحلیل ہو کر رہ گیا۔ وہ دروازہ سے نکلی ہی ہوگی کہ کانپتی ہوئی آواز میں اقبال نے پھر آواز دی "طلعت!"

"فرمائیے؟" کہتی ہوئی طلعت پھر اس کے پلنگ کے قریب آ گئی۔ اقبال کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دماغ معطل ہو گیا۔ اسے کیا کہنا چاہیئے؟ آخر کہنے کی بات ہی کونسی تھی۔ کئی منٹ گذر گئے۔ طلعت مسکرا رہی تھی۔

"ذرا میری عینک دینا" اقبال نے بغیر سوچے کہا۔

"آپ کی عینک۔ کہاں رکھی ہے؟" طلعت نے متلاشی نظروں سے

اِدھر اُدھر دیکھا۔

"جی؟" اقبال نے غیر مستقل لہجہ میں کہا۔

"اوہو۔ آپ کے سرہانے ہی تو رکھی ہے۔" اس نے ہلکے سے قہقہہ کے ساتھ کہا۔

"اوہ معاف کرنا۔" اقبال نے نادم ہوتے ہوئے کہا اور عینک اٹھا کر صاف کرنے لگا۔ طلعت دلچسپی سے اس کی حرکتوں کو دیکھتی رہی۔ اقبال نے غیر معمولی احتیاط سے عینک لگانے کے بعد طلعت کی طرف دیکھا اور دونوں خواہ مخواہ ہنس دیئے۔ اقبال کے حواس کچھ کچھ ٹھکانے آئے۔ اس نے سلسلہ جاری رکھنے کے لئے کہا "ذرا میرا سگریٹ کیس دیکھئے کہاں رکھا ہے اور آپ بھی دیکھنے لگا۔"

"کہیں وہ بھی آپ کے سرہانے ہی تو نہیں رکھا۔" طلعت نے شوخی سے کہا۔"

"نہیں!" اقبال نے احتیاطاً تکیہ کے نیچے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کو یقین ہے؟" طلعت نے میز کی چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"قطعی!" اقبال نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔"

نہ معلوم کہاں سے طلعت نے سگریٹ کیس ڈھونڈھ نکالا اور اقبال کو دیتے ہوئے کہا "آپ چائے ہم لوگوں کے ساتھ پئیں گے یا میں یہیں بھیج دوں؟"

"آپ کی رائے میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" اقبال نے تمسخرانہ لہجہ میں پوچھا۔

"مجھے سوچنے کا موقع دیجئے" طلعت نے عجیب انداز میں اپنے حسین

چہرے پر بناوٹی فکر کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔
اقبال صرف ہنس سکا۔
" ہاں! میری رائے میں آپ کو ہم لوگوں کے ساتھ ہی چار پیی چاہئے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ دورانِ چار میں میری طرف بالکل نہ دیکھیں جیسا کہ آپ رات کے کھانے پر کرتے رہے تھے.........." طلعت نے گردن مٹکا کر رسیلی آنکھوں میں مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔
" شرط نامنظور کی جاتی ہے۔" اقبال نے نہ معلوم کس طرح کہا۔" لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ چار کے ساتھ کھلائیں گی کیا؟ میں ذرا ڈبل ناشتہ کرنیکا عادی ہوں۔"
" ٹوس۔ مکھن۔ انڈے، اور ــــ اور ــــ اگر آپ چاہیں تو قورمہ، بریانی باقرخانی، پلاؤ، متنجن، مرغی۔ اور ــــ اور ــــ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
" اوہ!" بہت سا شکریہ........
" تو آپ جلدی تیار ہو کر آئیے۔" اور یہ کہہ کر طلعت چلتی بنی۔
غرض اسی قسم کی خوش فعلیوں اور دلچسپیوں میں کئی دن گذر گئے اقبال اور طلعت کی بے تکلفیاں بڑھتی گئیں۔ اقبال کے دل میں طلعت کی محبت جاگزین ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر طلعت اسے حاصل نہ ہوئی تو وہ خودکشی کرلے گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آیا طلعت کے دل میں بھی اس نے کوئی جگہ حاصل کی یا نہیں؟ ایک شام کو وہ مغموم سا بیٹھا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر آنکھیں بند کر لیں۔ انگلیوں کی ملائمت نے فوراً غمازی کر دی لیکن اقبال نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ کئی منٹ گذر گئے اور وہ اسی طرح بُت بنا بیٹھا رہا۔ بالآخر ایک حسین قہقہے کے ساتھ طلعت نے خود ہی ہار مان لی۔ اور

اقبال کے روبرو ہو بیٹھی۔ اقبال نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا:۔
"خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ آخر سعادت مند لڑکی ہو۔ لیکن سچ کہنا اس وقت تمہیں اس شکست سے کتنا رنج ہوا؟"

طلعت نے ناک کو ماتھے پر چڑھا کر کچھ ایسی شکل بنائی کہ اقبال ہنستے ہنستے لوٹ گیا" ذرا میز پر سے میری عینک دیجئے" تاکہ میں ڈارون کی دادی اماں کی شکل اچھی طرح دیکھ سکوں" اقبال نے ہنستے ہوئے کہا اور طلعت بھی بے اختیار ہنس پڑی۔ آہ! وہ موسیقی سے لبریز ہنسی جو اقبال کی روح کے ایک ایک تار میں گونج گئی۔

طلعت نے میز پر سے عینک اٹھا کر خود لگا لی اور اقبال کے منہ میں سے سگریٹ نکال کر ایک چھوٹا کش لگاتے ہوئے کہا — " تو میرے عزیز طالب علمو! میں تمہیں اپنے مشرقی بنگال کے سفر حالات سنا رہا تھا........
ایک دم سے طلعت کو کھانسی اٹھی۔ سگریٹ کا دھواں اس کی ناک میں چڑھ گیا۔" اقبال نے جھپٹ کر پانی کا گلاس دیتے ہوئے عینک اتار کر خود لگائی۔ اور نرمی سے کہا" خدا کے لئے طلعت میری سنو۔ مجھے تم سے ایک نہایت اہم معاملہ پر گفتگو کرنی ہے"!

"کیا دنیا میں کوئی بات بھی اہم ہو سکتی ہے؟" طلعت نے گلاس میز پہ رکھتے ہوئے کہا۔

" ہاں! اور وہ میری محبت ہے" اقبال نے جی کڑا کر کے کہا۔

" ا ہا ہا ہا———!" طلعت نے ایک گونجدار قہقہہ لگایا۔" آپ کی محبت!! یعنی چہ؟"

" سنو طلعت! میں تمہاری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں"۔ اقبال نے

غضب ناک لہجہ میں کہا۔

" بالکل درست ابھی آپ نے اپنی سات عدد ٹائیاں جلادیں" طلعت نے میز کی طرف اشارہ کیا جہاں سے دھوئیں کے بادل بلند ہو رہے تھے۔ اقبال دوڑ کر میز کے قریب پہنچا۔ اس نے طلعت کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ لڑھک کر ٹائیوں کے انبار میں جا پڑا اور آگ لگ گئی اقبال نے جلدی جلدی آگ بجھائی۔ طلعت کے نقرئی قہقہوں نے باجہ سا بجا رکھا تھا۔ اقبال بھی ہنستا رہا۔ اقبال نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ پھر طلعت کا ہاتھ پکڑ کر انتہائی سنجیدگی سے کہا :۔

" سچ سچ بتاؤ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے ؟"

"طلعت نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور کہا اتنی ! "

اقبال وفورِ شوق میں طلعت کے کھلے ہوئے بازوؤں میں جا پڑا اور وارفتگی کے عالم میں اس کے شکریں لبوں پر اپنے خشک و مرتعش لب رکھ دیئے طلعت کے جسم میں ایک خفیف سی کپکپی پیدا ہوئی۔ آہ! وہ ایک پاک تھرتھری جو پہلے بوسہ پر ایک دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہوتی ہے

محبت اسی وقت تک کیف و سرور کی حامل ہے جب تک کہ طالب و مطلوب ایک دوسرے سے ملتے نہیں۔ کہاں یہ کہ وہ ازدواج کے سے قبیح رشتہ میں جکڑ دئے جائیں۔ ساری شعریت تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور محبت لازمی طور پر نفرت و حقارت میں تبدیل ہو جاتی ہے وجہ ظاہر ہے۔ مسلسل یکجائی کے سبب وہ ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ پھر جوں جوں ایک دوسرے کے عیوب ظاہر ہوتے جاتے ہیں ان کی وہ بے بیشمار و لاتعداد

توقعات جو شادی سے پہلے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی تھیں ایک ایک کرکے فنا ہوتی جاتی ہیں۔ فی الحقیقت اگر ازدواج محبت کامیاب ہوجائے تو فطرت کے بہت سے قانون درہم برہم ہوجائیں۔

اقبال اور طلعت بھی کم و بیش نصف سال تک محبت کے جلد اتر جانے والے نشہ میں سرشار رہے۔ ساری دنیا انھیں عیش کا پیغام دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نئی نویلی جوانیاں تھیں۔ امنگوں اور ولولوں کا ایک سیلاب تھا جن سے تشنہ کام دل سیراب ہوتے تھے۔ کائنات سے بے خبر وہ عشق و جنون کی رو میں بے غل و غش بہے چلے جارہے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد سیراب ہوگئے۔ وقت کے ساتھ عشق کے بھوت کی آہنی گرفت کمزور ہوتی گئی۔ اس "اجنبیت" کے دور ہونے کے بعد جو عشق کے لیے لازمی چیز ہے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر و منزلت کم ہونی شروع ہوئی۔ انفرادیت مدغم ہونے لگی۔ شخصیت نے عمومیت اختیار کرلی۔ مسلسل مشاہدہ نے ایک دوسرے کے عیوب ظاہر کرنے شروع کیے۔ پھر ستم پر ستم یہ کہ طلعت اب بھی اقبال کو اپنا جاں نثار عاشق تصور کرتی تھی اور ہر جگہ اقبال سے "خراج نیاز" حاصل کرنے کی دعوے دار۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان فرائض میں جو بحیثیت بیوی کے عائد تھے کمی آنے لگی۔ ادھر اقبال طلعت کو ایک زرخرید لونڈی سے زیادہ کچھ اور سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ کیسی محبت اور کہاں کا عشق یہ تو زن و شوہر کا خالص "کاروباری رشتہ" تھا۔ احساسات و جذبات کا یہاں گیا گذر۔ ایک طرف حقوق تھے تو دوسری جانب فرض اور بس۔ جہاں ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی کوتاہی ہوئی وہ رشتہ معرض خطر میں آیا۔ الغرض دونوں کے دلوں میں محبت کے نقوش تبدریج مٹنے لگے اور ان کی جگہ

نفرت وحقارت نے اپنا سکہ جما لیا۔ تا آنکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اقبال ہمہ وقت یہی محسوس کرتا کہ طلعت سے شادی کر کے وہ ایک ایسے گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے جس کا کفارہ کسی طرح ممکن ہی نہیں اور طلعت بھی یہی سمجھتی کہ جس دن اقبال کے ساتھ اس کا سنجوگ قائم ہوا اسی دن اس کی قسمت پھوٹ گئی۔

ایک رات اقبال ذرا دیر سے گھر میں آیا۔ شاید کالج میں کوئی ٹمٹنگ وغیرہ تھی۔ گھر کی چار دیواری پہ ایک غمناک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اقبال اس کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ لباس تبدیل کر رہا تھا کہ "ریحانہ" طلعت کی محبوب بلی اس کی ٹانگوں میں آ کر لیٹ گئی اور اپنی مسلسل "خرر خرر خرر خرر" سے اس کا استقبال کرنے لگی۔ اقبال کو بلیوں سے عموماً اور ریحانہ سے خصوصاً ازلی نفرت تھی۔ چمکدار بوٹ کی ٹھیس گھوڑوں کی طاقت سے ریحانہ کے سر پر پڑی اور وہ کئی فٹ کی بلندی پہ اڑتی ہوئی رجّیا بوا کے گلے کا ہار ہو گئی ایک مہیب چیخ کے ساتھ رجّیا بوا نے کھانے کی کشتی کو قالین پر اس نزاکت کے ساتھ پھینکا کہ سارا قالین چپ چپ ہو گیا اور وہ خود اول فول بکتی ہوئی اپنی مالکن کے پاس پہنچی۔

"آپ آ گئے۔ ہوں؟ طلعت بھری ہوئی شیرنی بنی کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

تین ہزار مرتبہ سمجھا چکا ہوں کہ یہ کمبخت بلی میرے کمرے میں نہ آنے پائے۔ آخر یہ کیا ——— ؟" اقبال نے گرج کر کہا۔

میں بھی دو لاکھ مرتبہ عرض کر چکی ہوں کہ ریحانہ میرے دم کے ساتھ ہے جب تک میں اس گھر . . . . "

" اگر ایسا ہی ہے تو مجھ کو یکی! سائیں . . . تو سے باندھ کر رکھو تم آ ہو گھر

کبھی بھی میں نے اسے اپنے کمرے میں پایا تو ـــــــ تو ـــــ"

"تو ـــ کیا ـــ ؟"

"تو میں اسے حلال کر کے رکھ دوں گا" اقبال نے اپنے لہجہ میں خونخواری پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے پہلے آپ میرا گلا گھونٹ دیجیے" طلعت نے قریب قریب روتے ہوئے کہا۔

"فضول مت بکو جی! تمہاری خواہ مخواہ ضد کی عادت ہو گئی ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ منحوس بلی اگر تمہیں عزیز ہے تو اسے اپنے پاس رکھو میرے کمروں میں کیوں نحوست پھیلاتی ہے"

"آخر جانور ہی تو ہے۔ میں ...."

"جانور وانور میں نہیں جانتا جی۔ ہاں! جانور!! پھر ایسے جانور کو آخر پالا ہی کیوں جائے؟!"

"افسوس! آپ کو مجھ سے بالکل محبت نہیں!"

"شئے شئے! پھر وہی بیوقوفی کی باتیں۔ یہاں محبت کا کیا ذکر ہے"

"یہی کہ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو آپ میرے ساتھ اتنی رعایت ضرور کرتے ــــــ"

"رعایت کیا؟ یعنی یہ کہ تمہاری بلی کو گلے میں ڈھول کی طرح لٹکا لوں معاف کیجیے میں مجنوں تو ہوں نہیں جو لیلےٰ کے کتے کو چاٹتا پھروں"۔

دو منٹ تک خاموشی رہی۔ طلعت کا خون کھول رہا تھا۔

"اور یہ تو بتایئے! آج اتنی دیر تک کہاں رہے؟" طلعت نے گویا سیدا ننا جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"رہے جہاں ہمارا جی چاہا۔ تمھیں اس سے کیا؟" اقبال نے ترشی سے جواب دیا۔

"ہاں صاحب مجھے اس سے کیا! دو دو بجے رات تک بیٹھے سوکھتے رہو بھوکے مرو اور انعام یہ ملتا ہے کہ تمھیں اس سے کیا۔ ٹھیک ہے صاحب "کس گدھے نے کہا تھا کہ تم بھوکی مرو۔ مجھ نابکار کے لئے تم اتنی تکلیف کیوں گوارا کرتی ہو......"

"لیکن آپ کسی طرح دیر سے آنا نہ چھوڑیں گے؟"

"کیسے چھوڑ دوں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ اگر تم سے یہ کہوں کہ کام ہو جاتا ہے تو تمھیں یقین نہیں آتا۔ تم تو یہی سمجھتی ہو کہ میں ادھر ادھر سڑکیں لگاتا پھرتا ہوں"

"کام ایک دن کا دو دن کا یہ روز کی دیر تو خالی از علت نہیں"

"کیا کہا؟ خالی از علت نہیں۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ علت ضرور ہے اور تم اس علت سے بخوبی واقف ہو۔ کیوں؟" اقبال نے ترش ہنسی کے ساتھ کہا۔

"میں کیا جانوں!"

"میں بتاؤں؟ سنو! ایک عدد حسینہ!! سمجھیں؟؟" اقبال نے دلچسپی سے کہا۔

"وہ تو میں پہلے ہی سے جانتی تھی۔ آپ کے بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"تو میری رائے میں تم بھی اپنے لئے ایک چاہیتا پیدا کر لو —" "کس کیوں ایسا کروں۔ میری جوتی کو غرض پڑی ہے۔ یہ مشغلہ آپ ہی کو مبارک رہے" الیہ اسنے دانت پیستے ہوئے ادب سے کہا۔ "میاں! کھانا تو آپ

نے پھینک دیا۔ حکم ہو تو بازار سے منگا دوں یا پھر کچھ جلدی جلدی پکاؤں"۔
"کھانا میں نے پھینک دیا؟ ہاں بڑی بی سچ کہتی ہو۔ اس گھناونی بلی سے میں ہی تو ڈگیا تھا۔ خدارا تم جاؤ یہاں سے مجھے نہیں چاہیے کھانا وانا ہماڈ" اقبال نے ڈانٹ کر کہا اور رحیما بوا کان دبائے روانہ ہو گئیں۔
"تو یہ کہیے کھانا بھی وہیں اپنی چاہیتی کے ہاں کھا آئے۔ ٹھیک ہے"۔ طلعت نے کہا۔
"ہاں بیگم! تم سچ کہتی ہو۔ میری بہت سی چاہیتیاں ہیں اور اب میں روزان کے ساتھ کھانا کھایا کروں گا"۔
"آخر اس کٹ حجتی سے فائدہ؟" طلعت نے تنگ آکر کہا۔
"اتنا ہی جتنا تمہیں حاصل ہوتا ہے"۔ اقبال نے تیزی سے کہا۔
"میں پوچھتی ہوں کیا تم وہی آدمی ہو جو شادی سے پہلے مجھ پر جان چھڑکتے تھے؟"
"اور میں بھی پوچھتا ہوں کیا تم وہی طلعت ہو جو تھوڑے دنوں پہلے میری معمولی سی بات کو حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کیا کرتی تھیں۔ میری آسائش و آسودگی کا ہر طرح خیال رکھتی تھیں اور —— اور ...."
"تو اب کیا میں آپ کی حکم عدولی کرتی ہوں۔ آپ کی آسائش و آسودگی میں کوتاہی کرتی ہوں؟"
"بالکل نہیں۔ مجھے تمہاری وجہ سے بہت آرام ہے۔ ہر وقت میں سر میں لوٹتا رہتا ہوں۔ تم نے اور تمہاری بلی نے میرے گھر کو گلزار بنا رکھا ہے جس کی بوا رحیما باغبانی کرتی رہتی ہیں"۔ اقبال نے چبا چبا کر کہا۔
"توبہ ہے! آپ تو سیدھی سی بات پر لڑنے لگتے ہیں"۔

"ہاں عادت سے مجبور ہوں۔ تم تو کبھی لڑتی ہی نہیں۔ ہے نا۔ بڑی نیک۔ صلح جو۔ مرنجان و مرنج آدمی ہو۔"

"ہوں!" اقبال کے جلے کٹے فقرے طلعت کے دل کے پار ہو رہے تھے۔

"بتایئے بتایئے۔ میں نے کب لڑائی نکالی۔"

"پرسوں والی بات یاد کرو۔ کیا ہوا تھا؟"

"کیا ہوا تھا؟ یہی نا کہ آپ نے فخرو کو سگریٹ نہ لانے پر زدوکوب کیا اور میں نے اس غریب کی حمایت میں صرف اس قدر کہا کہ بیٹھک کی جھاڑ پونچھ میں سارا دن گذر گیا۔ دامن کو یاد نہ رہا۔"

"اچھا۔ پچھلے ہفتے کیا ہوا تھا۔ اس دن بھی لڑائی میں نے ہی نکالی تھی نا؟"

"کس دن؟ کب؟؟"

"جس دن بوا رحیما جا رہی تھیں اور تم نے ان کے بدلے مجھ پر صلواتوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میرا کیا قصور تھا۔ صرف اتنا کہ بوا رحیما سے اپنی پسند کا ایک نیا کھانا پکوانا چاہتا تھا اور اس بڑھی چڑیل نے میری حکم عدولی کی۔ کیا میں بھلے نہ ڈانٹتا؟ آخر نوکر ہیں۔ ہر مہینے گن گن کے تنخواہ کا دیتا ہوں کیا اتنا بھی حق نہیں کہ قصور کرنے پر سخت سست کہہ سکوں......"

"تو میں نے کیا کہا تھا۔ کونسی لڑائی نکالی تھی۔ یہی تو کہا تھا کہ نوکروں سے نوکروں کا سا برتاؤ کرنا چاہیئے پہلے تو ہنسی مذاق سے آپ نے ان کو سر پہ چڑھا لیا اور پھر یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے اشاروں پر جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ میں مانتی ہوں نوکروں کو ڈانٹنا ضرور چاہیئے لیکن جا و بیجا نہیں۔ اس دن رحیما نے انصاف سے دیکھیئے تو کوئی قصور نہیں کیا

تھا۔ پھر آپ جو حق ناحق اس کے لئے لے ڈ!ہیں گے تو وہ آخر کوئی زرِ خرید تو ہے نہیں جو جوتیاں کھائے اور آپ کے ٹکڑوں پر پڑی رہے۔ پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ گھس لگانے کو کوئی ماما نہیں ملتی اور جو ملتی ہے وہ کوڑی۔ کام کی نہ کاج کی اور منہ مانگی تنخواہ۔ رحیما جیسی محنتی، ایمان دار اور نرم زبان ماما ئیں کہاں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے میں اس کی معمول سے زیادہ خاطر رکھتی ہوں۔ ہاں اگر آپ کو یہ منظور ہے کہ میں دونوں وقت چولھے میں اپنا منہ جھلسوں تو بسم اللہ! آج ہی ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کیجیے۔ میری کونسی ایسی وہ کوئی عزیز ہے۔"

"خدا کا شکر تمہارا لکچر تو ختم ہوا۔ لیکن ایک رحیما ہی پر کیا موقوف ہے۔ تم ہمیشہ میرے مقابلے میں نوکروں کی طرف داری کرتی ہو۔ جہاں میں نے کسی نوکر کو ڈانٹا اور تم نے اس کی حمایت لی۔"

"غرض میں عیبی ہوں۔ وہ تو ہر طرح مجھ پر ہی آپ کی چھری تیز رہتی ہے،" طلعت نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"نہیں بیگم! تم تو سراپا خوبی ہو عیب تو پانچوں شرعی مجھ میں ہیں۔"

"آخر یہ بحث کب تک جاری رہے گی؟" طلعت نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

"جب تک تمہارا جی چاہے۔" اقبال نے اطمینان سے کہا۔

"تو ختم کرو اس قضیہ کو۔"

"بسم اللہ میں نے شروع کب ...... "

"تو گویا میں نے ابتدا کی تھی؟" طلعت نے ازسرِنو سلگتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو کیا میں نے کی تھی؟ ٹھیک ہے۔ میں ہی تو صلواتیں سنانے تمہارے کمرے میں گیا تھا۔"

"توبہ یا اللہ! کیسا میرا دم ضیق میں ہے"

"اور میں بہت خوش ہوں۔ تمہاری شکل دیکھتے ہی میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ تم ہر طرح میری خوشی اور خوشنودی کے اسباب مہیا کرتی رہتی ہو۔ ہے نا ـــــ؟"

"اور آپ بھی میری آسودگی کا بہت خیال رکھتے ہیں ـــــ سنئے صاحب ایک دفعہ اس قضیہ کو طے کر لیجئے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نالائق ہوں اور کسی طرح آپ جیسے نفیس الطبع انسان کی بیوی بننے کی اہل نہیں ہوں تو مجھے طلاق دیدیجئے اور پھر اپنی اسی چاہیتی کو لے آیئے جس کے ہاں آپ راتوں کو رہتے ہیں ـــــ"

"تمہیں معلوم ہے تم نے ایک سانس میں کتنی باتیں کہہ ڈالیں۔ خیر میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ سنتے سنتے عادی ہو گیا ہوں۔ اب خدارا مجھ غریب پر رحم کیجئے اور اپنی اس بکواس کو ختم کیجئے۔ میں خود ہی جان سے عاری ہو چکا ہوں۔ غضب خدا کا دو گھنٹے گذر گئے اور یہ کٹ حجتی کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی جب سے گھر میں قدم رکھا ہے ایک آفت برپا ہے۔ آخر میں کب تک آپ کی گالیاں سنے جاؤں اور کیوں؟ میں تنگ ...."

"یہ الٹی ہوئی گالیاں آپ دیتے ہیں یا میں؟"

"خیر! میں ہی دیتا ہوں۔ لیکن للہ آپ تشریف لے جائیے۔ کرم کیجئے مجھ بدنصیب کو میری حالت پر چھوڑیئے جائیے!!"

طلعت ایک تند و تیز "اونھ!" کے ساتھ بڑبڑاتی ہوئی روانہ ہوئی اور اقبال نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

آج کوئی نئی بات نہ تھی۔ قریب قریب روز کا یہی پروگرام رہتا تھا۔ حالات

اتنی خطرناک صورت اختیار نہ کرتے اگر دونوں ذرا سے ایثار سے کام لے لیتے لیکن ایثار تو کجا وہاں تو" احساس" کا بھی پتہ نہ تھا دونوں ایک دوسرے کے عیوب پر نظر رکھتے۔ ذرا ذرا سی بات کی پرچول رہتی۔ بات بات پر مین میخ نکالی جاتی اور پھر غضب یہ تھا کہ اقبال کے سر پر" رومان" کا بھوت سوار تھا "شانتی" کا تصور ہر وقت پیش نظر رہتا۔ طلعت کی ہر کوتاہی پر اس کا دل خون کے آنسو روتا اور فوراً اسے" شانتی" کا خیال آتا۔ بنفشہ ولاجورد کا ایک نورانی مجسمہ جوئی اور چمپا کے ہار پہنے اس کے پیش نظر ہوتا۔ جس کی حیات افروز مسکراہٹ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی۔ اس قسم کی لڑائیوں کے بعد وہ خاص طور پر پوشیدہ دراز میں سے" شانتی" کے خط نکال کر پڑھا کرتا تھا۔ چنانچہ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا اور کئی گھنٹے تک وہ بنفشہ ولاجورد کے سمندر میں غرق رہا" شانتی" کتنی فرشتہ خصلت لڑکی تھی وہ سراپا محبت تھی۔ آہ وہ اپنے صحرائی کی کتنی قدر کرتی تھی۔ اس کے صادق وخوشگوار خیالات ہمیشہ اس کے لئے پیام راحت وسکون لاتے تھے۔ بھینی خوشبو والے بنفشی خط اس کے لئے کتنے معانی رکھتے تھے۔ آہ! رومان کی وہ فردوسی وادیاں جہاں ان دونوں کے پاک دل مصروف گلگشت تھے۔ کتنا خوشش آئند تھا وہ زمانہ جب کہ وہ دونوں اپنے سینوں میں محبت کی آگ چھپائے پہروں ایک دوسرے کے تصور میں غرق رہتے تھے" اپنے صحرائی کی شانتی ——" اپنی شانتی کا صحرائی" —— ! وہ ایک ایک خط کو کئی کئی دفعہ پڑھ رہا تھا۔ یاس وناامیدی کی غمناک گھٹائیں اس پر چھا رہی تھیں شانتی! پیاری شانتی کے خطوط محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ کتنے سچے دل سے اس کی قدر کرتی تھی۔ کتنے پاکیزہ ذوق کی مالک تھی اور ساتھ ہی

کس قدر رومان پسند :-

"........ میں نے آپ کی ایک پرانی نظم دیکھی" جیون کا مدھر سوپن "- آہ! نہ پوچھئے کہ مجھ پر کیا گذر گئی۔ سچ کہیے! کیا واقعی آپ اسی ناہنجار دنیا کے باشندے ہیں یا آکاش پر رہنے بسنے والا کوئی سندر دیوتا ہے جو اپنی موہن مرلی سے عشق کے سہاونے گیت سنا سنا کر ساری دنیا کو سکون و راحت کا پیام سنا رہا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوئی ہے کہ آپ بھی میری طرح گوشت و پوست والے انسان ہیں، بہرکیف میرے لئے تو آپ انسان نہیں بلکہ ایک ایسی فردوسی ہستی ہے جو میرے خوابوں کے محل میں رہتی ہے اور جس کے تصور سے میں نے اپنے من کی دنیا اجاگر کر لی ہے۔ سنائیے پریت کی آنسوؤں سے بھری کہانی۔ سنائیے! عشق کی کبھی نہ بھولنے والی داستانیں۔ میں ان پریمی آنکھوں کی سرگذشت سننا چاہتی ہوں جنھوں نے کبھی محبوب کا جلوہ نہ دیکھا۔ اس دل کی دھڑکن سننا چاہتی ہوں جسے محبوب نے ٹھکرا دیا ......"

کئی گھنٹے گذر گئے اور وہ شانتی کے محبت بھرے خطوں میں غرق رہا۔ آہ! اس نے شانتی کی قدر نہ کی۔ کیوں اس نے سلسلہ مراسلت منقطع کیا۔ کتنی منحوس تھی وہ گھڑی جب کہ شانتی کی جگہ طلعت نے اس کے دل میں جگہ پائی۔ وہ طلعت تو شانتی کی پیزار کے برابر بھی نہیں ــــ لیکن نہ معلوم شانتی اب کہاں ہے وہ "س ق" معرفت پوسٹ ماسٹر لکھنؤ کو ایک دو نہیں بیسیوں خط لکھ چکا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ کیا وہ آسمانی ہستی ہمیشہ کے لئے سو گئی

نہیں اس کا دل کبھی اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن پھر خطوں کا جواب کیوں نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ ہندوستان کے کسی اور گوشہ میں چلی گئی ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل غم کے اتھاہ غار میں ڈوب جاتا۔ شانتی اس کے نزدیک مر چکی تھی۔ زندگی بھر وہ اس کے متعلق کچھ نہ معلوم کر سکے گا۔ لیکن یہ خط۔ یہ کبھی نہ فنا ہونے والے نقوش محبت ہمیشہ اس کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔ اس نے ان خطوں کو کئی بار چوما اور پھر احتیاط سے دراز میں بند کر دیا۔

ایک سہانی صبح طلعت نے برآمدے میں ناشتہ کا انتظام کیا کچھ دن سے مولوی شمس صاحب بطور مہمان آئے ہوئے تھے طلعت ان کی خاطر مدارات میں نمایاں حصہ لے رہی تھی۔ اقبال ایک لحاظ سے مولوی شمس کا ممنون تھا کہ ان کے آجانے سے گھر میں ذرا امن ہو گیا تھا، دوسرے یہ کہ ان کے طفیل میں اس کی بھی اچھی خاطر ہو رہی تھی۔

اقبال "سن رائز" کو ادھر ادھر سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر "پرسنل کالم" پر پڑی اور وہ کرسی سے دو فٹ اونچا اچھل گیا۔ چار کی میز گرتے گرتے بچی۔ بے انتہا اچنبھے بے انتہا خوشی اور بے انتہا حیرت نے بہ یک وقت اس کے دماغ پر دھاوا بول دیا۔ ایک نمایاں جگہ پر خاصے جلی حروف میں یہ پیام درج تھا۔

"شانتی بنام صحرائی ———— تم کہاں ہو؟"

دو منٹ تک اقبال کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کا تمام خون کھنچ کر دل میں جمع ہو گیا اور پھر ایک سیمابی کیفیت کے ساتھ اس کی سست نبضوں میں دوڑ گیا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ حواس آہستہ آہستہ ماؤف ہو رہے تھے

کس قدر رومان پسند :-

"......... میں نے آپ کی ایک پرانی نظم دیکھی "جیون کا مدھر سوپن" آہ! نہ پوچھئے کہ مجھ پر کیا گذر گئی۔ سچ کہیے! کیا واقعی آپ اسی ناہنجار دنیا کے باشندے ہیں یا آکاش پر رہنے بسنے والا کوئی سندر دیوتا ہے جو اپنی موہن مرلی سے عشق کے سہاونے گیت سنا سنا کر ساری دنیا کو سکون و راحت کا پیام سنا رہا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ آپ بھی میری طرح گوشت و پوست والے انسان ہیں، بہرکیف میرے لئے تو آپ انسان نہیں بلکہ ایک ایسی فردوسی ہستی ہے جو میرے خوابوں کے محل میں رہتی ہے اور جس کے تصور سے میں نے اپنے من کی دنیا اجاگر کر لی ہے۔ سنائیے پریت کی آنسوؤں سے بھری کہانی۔ سنائیے! عشق کی کبھی نہ بھولنے والی داستانیں۔ میں ان پریمی آنکھوں کی سرگزشت سننا چاہتی ہوں جنھوں نے کبھی محبوب کا جلوہ نہ دیکھا۔ اس دل کی دھڑکن سننا چاہتی ہوں جسے محبوب نے ٹھکرا دیا......"

کئی گھنٹے گذر گئے اور وہ شانتی کے محبت بھرے خطوں میں غرق رہا۔ آہ! اس نے شانتی کی قدر نہ کی۔ کیوں اس نے سلسلۂ مراسلت منقطع کیا۔ کتنی منحوس تھی وہ گھڑی جب کہ شانتی کی جگہ طلعت نے اس کے دل میں جگہ پائی وہ طلعت تو شانتی کی پیزار کے برابر بھی نہیں — لیکن نہ معلوم شانتی اب کہاں ہے وہ "س ش" معرفت پوسٹ ماسٹر لکھنؤ کو ایک دو نہیں بیسیوں خط لکھ چکا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ کیا وہ آسمانی ہستی ہمیشہ کے لئے سو گئی

نہیں اس کا دل کبھی اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن پھر خطوں کا جواب کیوں نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ ہندوستان کے کسی اور گوشہ میں چلی گئی ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل غم کے اتھاہ غار میں ڈوب جاتا۔ شانتی اس کے نزدیک مر چکی تھی۔ زندگی بھر وہ اس کے متعلق کچھ نہ معلوم کر سکے گا۔ لیکن یہ خط۔ یہ کبھی نہ فنا ہونے والے نقوش محبت ہمیشہ اس کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔ اس نے ان خطوں کو کئی بار چوما اور پھر احتیاط سے دراز میں بند کر دیا۔

ایک سہانی صبح طلعت نے برآمدے میں ناشتہ کا انتظام کیا کچھ دن سے مولوی شمس صاحب بطور مہمان آئے ہوئے تھے طلعت ان کی خاطر مدارات میں نمایاں حصہ لے رہی تھی۔ اقبال ایک لحاظ سے مولوی شمس کا ممنون تھا کہ ان کے آجانے سے گھر میں ذرا امن ہو گیا تھا، دوسرے یہ کہ ان کے طفیل میں اس کی بھی اچھی خاطر ہو رہی تھی۔

اقبال "سن رائز" کو ادھر ادھر سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر "پرسنل کالم" پہ پڑی اور وہ کرسی سے دو فٹ اونچا اچھل گیا۔ چائے کی میز گرتے گرتے بچی۔ بے انتہا اچنبھے، بے انتہا خوشی اور بے انتہا حیرت نے بہ یک وقت اس کے دماغ پہ دھاوا بول دیا۔ ایک نمایاں جگہ پہ خاصے جلی حروف میں یہ پیام درج تھا۔

"شانتی بنام صحرائی ——— تم کہاں ہو؟"

دو منٹ تک اقبال کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کا تمام خون کھنچ کر دل میں جمع ہو گیا اور پھر ایک سیمابی کیفیت کے ساتھ اس کی سست نبضوں میں دوڑ گیا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ حواس آہستہ آہستہ ماؤف ہو رہے تھے

کہ ایک دم سے اس کی نظریں طلعت کی خونخوار آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اخبار اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور پھر وہ بادلِ ناخواستہ ناشتہ کی طرف مائل ہوا۔ جلدی جلدی چاء کی پیالی چڑھائی اور مولوی شمس سے معذرت کر کے اخبار اٹھاتا ہوا وہ روانہ ہوا۔

صاف ستھری سڑک پر موٹر کار برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور اقبال کو ساری دنیا چکراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے دماغ پر فالج کا سا اثر تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ اپنے دل کی دھڑکن صاف طور سے سن رہا تھا۔

"شانتی صحرائی ——— صحرائی شانتی!!"

یکایک موٹر رکی اور اقبال کے حواس مجتمع ہوئے۔ وہ تیز قدموں سے ڈاک خانہ میں داخل ہوا اور فوراً ہی "سن رائز" کے پرسنل کالم کے لئے ایک پیام بذریعہ تار روانہ کیا۔ بعد کا وقت کس طرح گذرا یہ بیان کرنے کے لائق نہیں سارے دن شانتی کا تصور اس کے دماغ میں گونجتا رہا۔ ہر وقت دہر لحظہ شگفتہ و لاجورد کا مجسمہ اس کے پیش نظر ہوتا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔

دوسرے دن علی الصبح اس نے سن رائز کے "پرسنل کالم" کو اپنی ناک کے قریب لا کر اپنا پیام پڑھا:۔

"الم نصیب صحرائی کی طرف سے محبت کی دیوی شانتی کی خدمت میں "ہدیہ الفت"

"میں زندہ ہوں لیکن قریب المرگ۔ جلد خبر لو۔ پتہ دہی"

دوسرے ہی دن سے اس نے پوسٹ آفس کے چکر لگانے شروع کر دیئے

صبح سے شام تک کم از کم بیس پھیرے ہو جاتے۔ بالآخر ایک دن جب کہ وہ بالکل مایوس ہو جانے والا تھا کلرک نے اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں ایک بنفشی لفافہ دیا اقبال کو ایسا معلوم ہوا گویا مدت کا کھویا ہوا خزانہ اسے اچانک مل گیا۔ وہی خط تھا! چمپا اور جوہی کی مخلوط خوشبو میں بسا ہوا۔ بنفشی کاغذ پر لاجواب دستِ نائی میں بہترین کتابت! اقبال کا سر چکرانے لگا۔ وہ سمجھا یہ زندگی کی آخری کشمکش ہے وہ تیزی سے قریب کے ایک ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ اور ایک کونے میں بیٹھ کر متعدد سگریٹ پینے کے بعد اس نے خط پڑھنا شروع کیا :۔

" شام مراری کے چرنوں کو پرنام!

آج میں کس قدر خوش ہوں ـــــ بے انتہا مسرور ـــــ کہ اپنی کلپتی ہوئی آتما کی اندوہ گیں پکار کو پھر ہمدرد کانوں تک پہنچانے کا موقع ملا ـــ اس انوپ ہستی کو آج میں نے پھر پا لیا۔ جو میرے لئے سب کچھ تھی۔ جسے میں نے عرصہ ہوا فراق کے گھٹا ٹوپ میں کھو دیا تھا۔ آہ! آج آکاش کے سارے دیوتا بچھڑے ہوئے دلوں کے ملاپ پہ نشیلے گیت گا رہے ہیں :۔

"پریم نے من کی گنگا جمنا کو ـــ سکھ سنگم پہ ملا یا!"

سچ کہئے اس منحوس بردگ کے ختم ہو جانے سے آپ کو کس قدر خوشی ہوئی؟ میں تو قریب قریب دیوانی ہو رہی ہوں۔ میں کوستی ہوں اس منحوس گھڑی کو جب کہ ہماری خط و کتابت بند ہو ئی۔ لیکن خیر۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم جو ایک دوسرے کو مردہ سمجھتے تھے پھر آ ملے۔

جو جو انقلابات مجھ پر ہو گذرے انھیں قلمبند کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں مختصر یہ کہ ــــ یہ سن کر شاید آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں کہ میری شادی ہو گئی۔ لیکن ٹھہریئے۔ آپ کے جوشیلے گیتوں نے مجھے اس حد تک وحشی کر دیا تھا کہ آہ! میں ایک نامعقول درندہ سے محبت کر بیٹھی۔ اسی جرم کی پاداش میں مجھے ہمیشہ کے لئے اس بن مانس کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد مجھ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ محبت کا طلسم چورا چورا ہو گیا۔ پژمردہ ارمان میرے دل کی حسرت سامانیوں میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ وہ بندر مجھے بات بات پر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ آہ! کہاں تک لکھوں۔ ایک مسلسل عذاب ہے۔ مصیبت کی کہانی پھر کبھی سناؤں گی۔ برسوں کے بعد آج مجھے خوشی نصیب ہوئی اسے بھی دکھ کی داستان دوہرا کر کیوں ضائع کر دوں۔ مجھے آج دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔ رومانی آگ جو مسلسل جمود کے سبب سرد ہو چکی تھی آج پھر بھڑک اٹھی۔ مجھے مسرت ہے ذرا پھر ایک نعرہ لگا لینے دیجئے! اب انشاء اللہ آپ سے خوب دل کھول کر باتیں ہوں گی پہلے میں آپ کی زبانی یہ سن لوں کہ آپ خیریت سے ہیں اور یہ کہ مجھے بھی کبھی یاد کیا یا نہیں؟

ہاں میرا پتہ فی الحال "ش" معرفت پوسٹ ماسٹر الہ آباد ہے۔" آپ چونک پڑے! کیوں؟ ہاں میں آپ ہی کے شہر میں ہوں۔ لیکن آپ سے کتنی دور! میں بے چینی سے آپ کے خط کی منتظر رہوں گی!   ہمیشہ آپ کی داسی   "ش شی"

اقبال واقعی چونک پڑا۔ "شانتی الہ آباد میں! حیرت ہے! اور پھر بھی مجھ سے دور! ناممکن۔ میں اس سے مل کر رہوں گا" پہروں وہ رومانی نشہ میں سرشار رہا۔ مدت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھی تھیں۔ اس کے غمگین دل کو شانتی کے تصور نے ڈھارس دی۔ طلعت کی ایک ایک کج ادائی یاد آئی۔ تمام عیوب دن کی روشنی میں چمکتے نظر آئے۔ لیکن خیر۔ شانتی کا پیارا خیال ان سب کی تلافی کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے فوراً ہی ایک طویل و بسیط خط لکھ ڈالا۔ اپنے دل کی غمناک سرگذشت — ایک "بلیوں کی خالہ" بیوی — اس کے تمام عیوب مع مبالغہ — آرزوؤں اور ارمانوں کی موت — گھر کی الجھنیں — ہر لحظہ شانتی کا تصور — رومانی خیالات کا ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانا اور پھر عرصہ کے بعد خوابیدہ حسرتوں کی بیداری اور ساتھ ہی:۔

"...... لیکن اب "بلیوں کی خالہ" کے مظالم کی حد ہو چکی خدا نے ہمیں پھر ایک دوسرے سے ملا دیا۔ تم نے اپنے کسی پرانے خط میں لکھا تھا "کہ میرے شریر یکارو نگ رونگ تمہاری پریت کے گیت گاتا ہے"۔

میں انہیں الفاظ کو تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ کیا اب بھی تمہارے یہی جذبات ہیں؟ شانتی! غور کرو۔ یہ ظلم ہے کہ نہیں، ہم ایک ہی شہر میں رہیں اور پھر بھی ایک دوسرے سے نہ ملیں۔ امتداد زمانہ نے ہم دونوں کے معصوم دلوں پر ہزاروں چرکے لگا دئے۔ یہ کتنا ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مل کر اپنے دل کے زخموں کو کسی حد تک مندمل کر لیں۔ خدا کے لئے رحم کرو ہمیں ضرور ملنا چاہیئے۔ ضرور۔ آخر کب تک ہم اپنے پاک محبت

کو خطوں پر ضائع کرتے رہیں . . . . "

تیسرے ہی دن شانتی کا بنفشی خط موصول ہوا۔ وہ کسی طرح صحرائی کی درخواست منظور کرنے کے لئے تیار نہ تھی :۔

" . . . . تم مجھ سے مل کر کبھی خوش نہ ہوگے۔ ایک مرجھائی ہوئی کلی میں رنگ و بو کی تلاش عبث ہے دوسرے یہ کہ میں اپنے "بن مانس" سے حد درجہ متنفر ہوں۔ پھر بھی اس کے ساتھ بے وفائی کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میں تم سے کبھی نہیں مل سکتی۔ یہ کافی سے زیادہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہیں۔ اور ہر ہفتے ہمیں ایک دوسرے کی دلی کیفیات کا موقع ملتا رہتا ہے، اسی سے ہمارے شوق کی تسکین ہو جانی چاہیئے ۔ خدارا تم کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا . . . . . "

لیکن اقبال مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ چاہے جو کچھ ہو وہ شانتی کو تلاش کر کے رہے گا۔ چنانچہ اس نے ایک سرسری جواب لکھ کر روانہ کیا اور دوسرے ہی دن پوسٹ آفس میں اڈا جما دیا۔ ایک دن صاف گذر گیا اور کوئی بھی خط لینے نہ آیا۔ دوسرے دن مولوی شمس اندر داخل ہوتے نظر آئے اقبال نے دیوار کی آڑ میں اپنے آپ کو چھپایا کہ کہیں یہ خبیث مولوی اسے دیکھ لے۔ لیکن دیکھ بھی لے تو کیا ہے۔ آخر ڈاک خانہ میں آنا جانا کوئی جرم تو ہے نہیں۔ مگر یہ مولوی آخر یہاں کیوں آیا۔ کون سا ایسا کام ہو سکتا تھا۔ وہ مولوی شمس کی طرف برابر دیکھ رہا تھا۔ ہائیں! یہ کیا اسرار۔ شانتی کے نام کا خط اسے کیوں دے دیا گیا؟ یقیناً ڈاک خانہ والوں سے غلطی ہوئی۔ وہ دوڑ کر پوسٹ ماسٹر کے پاس جانا چاہتا تھا کہ مولوی شمس خوش خوش [illegible] آتے

نظر آئے ان کے ہاتھ میں وہی خط تھا۔ اقبال دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی وہ اس کے پاس سے گذرے اقبال نے ان کی گدی میں ہاتھ دیا۔

"بدمعاش! یہ خط تم کہاں لے جا رہے ہو؟"

مولوی شمس کو چکر سا آیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے "یقین! یہ تو میرا خط ہے۔ یہ۔ یہ۔ دیکھئے میرا پتہ" سن۔ معرفت پوسٹ ماسٹر الٰہ آباد" اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خط ہے؟ کیوں بکتے ہو۔ کس کے پاس سے آیا؟" اقبال نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"میرے دوست صحرائی کے پاس سے" مولوی نے کہا۔

"بکو مت جی! صحرائی میرا نام ہے۔ یہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا خط۔۔۔ تم میرے خط چرا کر لے جاتے ہو اور پھر طلعت کو دکھا دیتے ہو۔ میں تمہیں ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں"

"یہ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ہے! کیا صحرائی آپ ہی کا نام ہے؟"

مولوی شمس کا دم گھٹنے لگا — "آپ مذاق کرتے ہیں۔۔۔۔" شمس نے دانت پیستے ہوئے کہا — "میں مذاق کرتا ہوں۔ ہوں؟"

اقبال نے مولوی شمس کے ہاتھ کو بل دینا شروع کیا" اوہ! میرا ہاتھ ٹوٹا۔ ہائے رے اللہ۔ رحم اف"

"سچ سچ بتاؤ تم کب سے میرا خط چراتے ہو۔ بتاؤ جلدی"

"اچھا اچھا ابھی بتاتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ — کہ بات یہ ہے کہ آپا جان کے پاس صحرائی کے خط بہت عرصے آتے ہیں۔ شادی سے پہلے سے ان کا خط خراب ہے اس لئے میں ہی یہ خط لکھا کرتا تھا اور ڈاک خانہ

سے بھی ہمیشہ میں ہی خط لاتا تھا۔ خط کا مضمون وہ بناتی تھیں اور میں لکھا کرتا تھا۔ شادی سے پہلے لکھنؤ کے ڈاک خانہ میں خط آتے تھے اور میں ہی لایا کرتا تھا۔ بہت عرصہ تک خط و کتابت بند رہی۔ گذشتہ ہفتہ آپا نے مجھے بذریعہ تار بلوایا خط و کتابت پھر جاری ہو گئی تھی اور —— اور یہ تیسرا خط ہے جو میں یہاں سے ......"

"اچھا۔ اچھا۔ ختم کرو، اب اس لکچر کو۔ جاؤ اپنی آپا سے کہنا صحرائی مر گیا سمجھے ——"

رنگین و سہانے خوابوں کی کتنی حسرت ناک تعبیر! یاس، ناکامی، نا امیدی حیات افروز ارمان کا کس قدر حسرت ناک انجام۔ خوابوں کے سنہرے دھندلکے کے پیچھے موت کا سا بھیانک غار۔ طلعت "شانتی" ہے —" شانتی" طلعت آہ! یہ "بلبلوں کی خالہ" شانتی ہے۔ یہ "مرمروں کا ٹھیلہ" اف! بنفشہ دلا چور دھجری اور چھپا کے رنگین و معطر پردوں کے پیچھے یہ پنیر کا سوکھا ہوا ٹکڑا یہ "پن کشن" ناممکن! اگر یہ سچ ہے تو صرف ایک ہی علاج ہو سکتا ہے موت یقیناً اسے مر جانا چاہیئے۔ اس صدمہ کو وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ "اپنی سندر مرلی سے عشق کے اداس گیت سنانے والے شیام مراری! مجھے پریم کی لالہ زار سہاونی وادیوں میں لے چل! —— ہوں! کیا یہ اسی " خیلا جھٹلن " کی آواز ہے۔ توبہ! لیکن طلعت ہی اگر شانتی ہے تو اسے اپنے "صحرائی کو اقبال کی شکل میں دیکھ کر کتنا رنج ہوا ہوگا —— ٹھیک ہے دونوں قصوروار ہیں اور دونوں کو برابر کا صدمہ ہے —" اقبال اس خیال کے ساتھ ہی طلعت کے کمرے میں گیا۔ وہ کوچ پر منہ اوندھائے پڑی تھی۔

"تمہارا بن مانس حاضر ہے اے بی "بلیوں کی خالہ"! اقبال نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ طلعت نے آبدیدہ نظروں سے اقبال کیطرف دیکھا اور پھر منہ چھپا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اقبال نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں طلعت کی محبت بڑھتی جا رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں بھی اسے خوبی اور چمپا کی مخلوط خوشبو آئی"۔ سئے سئے شئے ...."

اس نے طلعت کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا" اٹھو۔ یہ کیا حماقت ہے طلعت ہم دونوں رومانے گدھے ہیں اور بس محبت کی اصلیت سے ڈر کر ہم صرف خیالی عشق چاہتے تھے۔ اتفاق سے ہم دونوں کی خط وکتابت شروع ہوگئی اور ہمیں موقع ملا کہ وہ اپنی شدید دلی کیفیات ایک دوسرے پر ظاہر کر دیں جنھیں ہم روبرو کبھی ظاہر نہ کر سکتے۔ اس کے بعد ہم دونوں ملے اور شادی ہوگئی۔ یہ اتفاق ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو پہچانا نہیں۔ بس چڑے چڑیا کی کہانی ختم ہوئی۔ صرف اس کا رنج ہے کہ میں طلعت کی شخصیت میں شانتی کو نہ پا سکا ...."

"یہ ماحول کا قصور تھا۔ مجھے بھی اقبال میں صحرائی کا عکس نظر نہ آیا۔ آپ بھی مجھے صرف" بلیوں کی خالہ" سمجھتے رہے اور میں آپ کو ــــ آپ کو ــــ ایہم ــــ بن مانس! طلعت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن اب کس قدر آسان ہے کہ ہم صحرائی اور شانتی بن کر رہیں۔ شانتی نے صحرائی کو اقبال کے تمام عیوب بتا دئے اور اب وہ ان عیوب کو دور کرنے کی کوشش کرے گا۔

ادھر صحرائی نے شانتی پر طلعت پر ساری کوتاہیاں ظاہر کر دیں۔ کیا وہ طلعت کی بجائے شانتی بننے کی کوشش نہ کرے گی" ....

صحرائی!!!" مسرت میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ کے ساتھ طلعت اقبال کے آغوش میں گری . . . .

"شانتی!!!" اقبال نے نرم وگرم لبوں پر ایک جوشیلی مہر ثبت کرنے کے بعد کہا —— "شانتی! تم نے اپنے خط میں دو دلوں کے ملاپ پر جو فقرہ اور گیت لکھا تھا وہ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں"

طلعت بھرائی ہوئی آواز میں بولتی ہے۔ خوشی کے آنسو اس کی آنکھوں سے جاری ہیں۔ اقبال بھی اس کے ساتھ ہم آواز ہے" آج آکاش کے سارے دیوتا بچھڑے ہوئے دلوں کے ملاپ پر نشیلے گیت گا رہے ہیں

پریم نے من کی گنگا جمنا کو . . . . . . سکھ سنگم پہ ملا یا . . . . "

رحیما بوا، فخرا اور مولوی شمس دروازوں میں سے جھانک رہے ہیں۔ محبت کے دیوانوں نے کمرہ سر پہ اٹھا رکھا ہے۔

"پریم نے من کی گنگا جمنا کو . . . . . سکھ سنگم پہ ملا یا"

سید انصار ناصر

بی اے، ایل ایل، بی دھلوی

حجابِ زندگی

"میرے محبوب میں دنیا کے تمام لوگوں کا قصور معاف کر سکتا ہوں کیونکہ وہ لائق فراموش ہونے کے باوجود ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ مگر تیرے کسی ایک قصور کو بھی معاف نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ناقابلِ فراموش ہونے کے باوجود ہمیشہ ذہن سے اتر جاتا ہے لیکن یقیناً تو اس رمز کو بھی سمجھتا ہو گا کہ کسی کی خطا کا ذہن سے اتر جانا ہی، اس کی اصل معافی ہے۔"

"اگر حسن وجمال کے ساتھ دولت وثروت بھی ہو تو شوہروں کی کمی نہیں خواہ سچی محبت کرنے والے میسر آئیں یا نہ آئیں۔ لیکن اگر غربت وافلاس کے ساتھ حسن وجمال بھی ہو تو عاشقوں کی کمی نہیں۔ خواہ مناسب شوہر نصیب نہ ہوں"

"جس شخص میں عمدہ شوہر بننے کی صلاحیت موجود ہے کبھی صدق

دل سے محبت نہیں کر سکتا اور جس کے قلب میں قدرت نے حقیقی محبت کرنیکا مادہ ودیعت کیا ہے شوہر بننے کی صورت میں ناکامیاب زندگی بسر کریگا۔

"حسن وعشق کا جھونپڑوں میں اتصال ممکن ہے اور محلوں میں افتراق یقینی"۔

طویل جدائی کا صدمہ بھی کچھ زیادہ شاق نہیں گذرتا اگر اس امر کا یقین ہو کہ ہمارے محبوب کو بھی ہم سے عشق صادق ہے۔ برخلاف اس کے ہر وقت کا اتصال باہمی بھی سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ جب یہ محسوس کر لیا جائے کہ اظہار محبت میں تصنع سے کام لیا جا رہا ہے۔ اعماق قلب سے نکلی ہوئی صدائے "الوداع" بدرجہا بہتر ہے اس "خوش آمدید" سے جس کو صرف نوکِ زبان سے ادا کیا گیا ہو۔

یہ تھے وہ نقوش زرین جن کو رتن بائی کے معجز نگار قلم نے اپنے ایک شعریت سے لبریز فلسفیانہ مضمون میں رسالہ میکش کے اوراق پر مرتسم کیا اور میری نظر انتخاب نے اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے ان سطور کو سرخ پنسل سے زیر خط کر دیا۔ تمام مضمون بحیثیت مجموعی صنف ادب میں ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ جس کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ اور خاص طور پر مندرجہ بالا سطور نے میرے دماغ پر ایسا اثر کیا کہ کئی روز تک سوائے ان کے کوئی دوسرا خیال میرے ذہن پر مسلط نہ ہو سکا۔ رتن بائی دنیائے ادب میں کوئی نئی ہستی نہ تھی۔ میں متعدد بار اس کے مضامین کا مطالعہ کر چکا تھا اور ہر دفعہ کوشش کرتا تھا کہ تبادلہ خیالات کے لئے کوئی سلسلہ شروع کروں۔ مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ لیکن اس مضمون

کا نشہ اس قدر خفیف نہیں تھا کہ تخیل انسانی پر طاری ہو کر بآسانی اتر جاتا۔ چنانچہ
میں نے تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس خاتون سے شرفِ تعارف حاصل کرنا چاہیئے۔
پہلے میں نے ارادہ کیا کہ اس مضمون پر ایک تقریظی تبصرہ کر کے خود اس کی
توجہ اپنی طرف مبذول کرلوں۔ مگر عورت کا سوال بہت ٹیڑھا تھا۔ قارئین
خیال کرتے کہ محض چھیڑنے کی غرض سے یہ صورت اختیار کی ہے۔ بہت کم
لوگ یہ سمجھ سکتے کہ درحقیقت اس مضمون نے میرے احساسات پر گہرا اثر کیا
ہے۔ اس لئے میں نے پہلا خیال ترک کر کے فیصلہ کیا کہ ذریعۂ خط مدیر میکشں
کی معرفت رجوع کر دوں۔ یہ سب سے زیادہ سہل طریقہ تھا۔ لیکن کیا لکھوں اسی
کے سوچنے میں کئی دن گذر گئے۔ خود میری ہستی بھی ایک ادیب کی حیثیت سے
روشناس خلق تھی۔ کئی تخیلی افسانوں میں مفروضہ خطوط میں نے درج کئے
تھے۔ لیکن جب حقیقت کی دنیا میں رتن بائی کو خط لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو
ایک عجیب کیفیت تمام بدن پہ طاری ہوئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے
اور اس کے درمیان کوئی مغائرت نہیں ہے۔ وہ مجھ سے واقف ہے اور میں
اس سے آشنا۔

کافی دماغ سوزی کے بعد میں نے ذیل کا خط لکھا اور رتن بائی کو مدیر
میکشں کی معرفت روانہ کر دیا:۔

محترمہ! تسلیم

معاف کیجئے۔ میں بغیر کسی سابقہ تعارف کے آپ سے سلسلۂ مراسلت
شروع کر رہا ہوں۔ لیکن غالباً دنیائے ادب میں یہ کوئی بیجا
جسارت نہیں ہے تاہم میں نے یہ جسارت کیوں کی؟ اس کا جواب

خود آپ کا مضمون دے گا۔ مجھے سخن شناسی کا دعویٰ نہیں۔ لیکن خوب و زشت میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہوں۔ اچھی چیز کو ہر شخص پسند کرتا ہے اور اظہار پسندیدگی میں دادِ سخن نہ دینا بدذوقی کا ثبوت بلکہ ایک حد تک ناانصافی ہے۔ لہٰذا آپ کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ کا مضمون نہایت کامیاب اور قابلِ قدر ہے ایک ہندو خاتون سے ایسی پاکیزہ اردو لکھنے کی توقع رکھنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ محبت کے ضمن میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے کیا وہ آپ کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہے! غالباً میرا یہ استفسار نازیبا نہیں۔ کیونکہ اپنے قیاسات کی تکمیل چاہتا ہوں جو صرف آپ ہی کی ذات سے ممکن ہے۔ فی الحال میرا کوئی مستقل پتہ نہیں ہے۔ اس لئے آپ مدیر مکیش ہی کی معرفت جواب سے سرفراز فرمائیں بہرنوع خط مجھے مل جائیگا۔

نوٹ:۔ غالباً میرے مضامین کا بھی مطالعہ فرمایا ہوگا۔

آپ کا

انجم جمالی

خط روانہ کر دیا۔ لیکن اس کے بعد سے میری روح جس اضطرابِ پیہم میں مبتلا ہوئی اس کا اظہار غیر ممکن ہے۔ میرے تصورات کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ہر وقت رتن اور صرف رتن ہی کا خیال رہنے لگا۔ عالمِ خواب میں بھی یہی نظر آتا۔ گویا وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ میرے جذبۂ تخلیق نے اس کے مادی خدوخال کو ان ادبی نقوش کے سانچوں میں ڈھال

لیا تھا۔ جنھیں وہ اپنے مضامین میں پیش کرتی تھی ——— فلسفیوں کی متانت و سنجیدگی ——— شاعروں کا کیف بیخودی ——— مخلوق سماوی کی الوہیت ——— دکھے ہوئے دلوں کا سوز دروں۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور دسویں دن ایک گلابی رنگ کا لفافہ ملا۔ تاخیر کی وجہ یہی تھی کہ وہ براہِ راست نہیں آیا تھا۔ بلکہ مدیر مکلش کی.... معرفت۔ طرزِ تحریر سے صاف ظاہر تھا کہ عبارت نسوانی دستِ نازک کی.... شاعرانہ جنبشوں کا نتیجہ ہے۔ لفافہ چاک کیا۔ خط پڑھا۔ لکھا تھا:۔

مکرمی! تسلیم۔

نوازش نامہ پیش نظر ہے۔ آپ نے جن الفاظ میں میری مضمون کی تعریف کی ہے ان کا دلی شکریہ۔ مگر وہ اس قدر تعریف کا مستحق نہیں۔ یہ صرف آپ کا حسنِ ظن ہے۔ لیکن خدارا یہ تو بتائیے کہ آپ کس بنا پر ایک ہندو خاتون سے پاکیزہ اردو لکھنے کی توقع نہیں رکھتے۔ کیا ہندوستانی زبان انگریزی میں قادر الکلام نہیں ہوتے؟ دنیا کی کسی زبان کو اور علم کے کسی شعبہ کو اگر علم کی غرض سے حاصل کیا جائے تو ہر فرد بشر اس میں مہارت تام حاصل کر سکتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہندو ہو یا مسلمان میں نے عربی اور فارسی کا وسیع مطالعہ کیا ہے، اس لئے اردو میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔

آپ یہ کیوں دریافت فرماتے ہیں کہ محبت کے ضمن میں میرے نتائج و افکار دلی تاثرات پر مبنی ہیں یا نہیں؟ آپ خود بھی صاحب

قلم ہیں۔ اپنے دل سے پوچھ لیجئے۔ البتہ میں اتنا عرض کرونگی کہ شاعر کے کلام کی شعریت محض الفاظ تک محدود ہوتی ہے اور وہ اس کیفیت بیخودی سے ناآشنا ہوتا ہے جس کا اظہار غزل کے ہر شعر میں کر دیتا ہے۔ الحمد للہ! کہ مجھے کسی سے محبت نہیں اور نہ اسکی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر بھی میرے خیالات کی پرواز اس نگری تک ہو سکتی ہے۔

جی ہاں! میں نہایت ذوق و شوق سے آپ کے مضامین کا مطالعہ کرتی ہوں۔ لیکن یہ نہ پوچھئے کہ ان سے کیا اثر لیتی ہوں۔

راقمہ:۔ رتن بائی

نوٹ:۔ "آپ کے نام میں اصلیت معلوم نہیں ہوتی کیا میں صحیح اسم گرامی معلوم کر سکتی ہوں؟"

دل مسرت سے لبریز تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا ہوں جس کی تمام فضا نغمہ و شعر و رومان کے امتزاج سے ترکیب پاتی ہے کائنات کا ہر ذرہ میری نظر کے سامنے سے رقص کرتا ہوا گذرنے لگا اسوقت زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ میں جوان ہوں رتن بائی کے خط کا ایک ایک لفظ میرے دل میں پیوست ہوتا چلا گیا۔ میرے تخیلات کی دنیا میں ایک نئی تعمیر کا اضافہ ہو رہا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر خط کا جواب لکھا اور روانہ کیا۔

رتن!

میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہارے[1] خط نے عین عالم انتظار
میں پہنچ کر میرے دل کو کس کس نوع سے سکون بخشا۔ آپ[2]
شاید محسوس بھی نہیں کر سکتیں کہ انتظار کے لمحے کس قدر کٹھن ہوتے
ہیں۔ خدارا جواب کے لکھنے میں تعویق نہ کیا کرو۔

نظریہ محبت کے ضمن میں مجھے آپ سے کسی قدر اختلاف ہے۔ محبت
کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو ضروریات زندگی میں شمار کیا
جا سکے۔ پھر آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں
نہ وہ اکتسابی چیز ہے جس کو حاصل کیا جا سکے۔ نہ ایسی شے کہ
لاحق ہو جانے کے بعد اس سے احتراز ممکن ہو ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اچھا میں آپ کے نظریہ کا تجزیہ بعد میں کروں گا یہ بتائیے کہ آپ
ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہیں یا ہنوز دامنِ دوشیزگی کے زیر سایہ
محو خواب ہیں۔ میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپکی
عمر کیا ہے تاکہ آپ کے قیاساتِ ذہنی کی بابت استنتاج کر سکوں
کہ ان میں پختگی ہے یا خامی۔

تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ شاعر کے کلام کی شعریت صرف
الفاظ تک محدود ہوتی ہے اور اسی لیے وہ صحیح کیف بیخودی
سے نا آشنا رہتا ہے۔ اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو آپ
کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ محبت کیے بغیر خیالات کی پرواز اس نگری

---

[1] و [2] تم اور آپ کے مختلف طرز تخاطب کو غلط نہ سمجھا جائے کیونکہ دانستہ ان سے جذبات کی کشمکش دکھانا مقصود ہے

تک ممکن ہے پہلے کسی سے دل لگا کر دیکھو پھر اصل شعریت سے لطف اندوز ہونا۔

بیشک میرا اصل نام کچھ اور ہے۔ تم اس کو معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو اس کو جان لینے سے تمہیں کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوگا البتہ اگر میرا موجودہ نام تم کو ناپسند ہے تو حسب منشا کسی دوسرے لفظ سے مخاطب کر سکتی ہو۔

میرے افسانوں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے تمہاری نظر سے نہ گذرا ہو تو ایک جلد بھیجدوں۔

جواب کے لیے کب تک منتظر ہوں ؟

تمہارا

(حسب منشا)

میں نے بہت ڈر ڈر کر خط لکھا تھا کہ کہیں کوئی جملہ ایسا رقم نہ ہو جائے جو برہمی مزاج کا باعث ہو۔ اپنے استفسارات کو بھی ایسے پیرایہ میں لکھا کہ اصل مقصد واضح نہ ہو سکے۔ مگر تم بہت دقیقہ رس تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس خط کا جواب حسب ذیل تھا :۔

انجم جمالی !

تم بڑے شریر اور شوخ معلوم ہوتے ہو اور اپنے پندار میں یہ سمجھتے ہو کہ دنیا کے باقی لوگ یتیم العقل اور کج فہم ہیں۔ کیا خوب! میری عمر کی بابت کتنے عجیب پیرایہ میں استفسار کیا ہے اور یہ بھی کہ میں انفرادی زندگی بسر کر رہی ہوں یا کسی کی شریک حیات بن کر میرے

خیالات کی پختگی یا خامی خود نفس مضمون اور طرز بیان سے واضح ہوسکتی ہے۔ عمر معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم معلول سے علت کا پتہ لگانا چاہتے ہو جو سراسر غلط ہے۔ میں تمھاری منشاء کو بخوبی سمجھتی ہوں۔ بس رہنے بھی دو۔ کبھی ہرگز نہ بتاؤں گی کہ کچھ عرصہ سے میرے قلب کی دھڑکن، نبض کی حرکت اور تنفس کے ہیجان میں غیر معمولی سرعت ہوگئی ہے ورنہ تم ضرور اندازہ لگالوگے کہ میں زندگی کے کس دور سے گذر رہی ہوں میں یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ میرے بستر کی سلوٹیں صرف میرے ہی اعضاء کی جنبشوں سے عالم وجود میں آتی ہیں۔ ورنہ تم یقین کرلوگے کہ رات کی تاریکی شروع ہونے کے بعد میں اپنی خوابگاہ میں اکیلی رہتی ہوں اور شاید ابھی تک دوشیزگی کی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ مجھے یہ کسی عنوان پسند نہیں کہ یہ راز تم پر منکشف ہوجائیں۔ براہ کرم اب کوئی سوال ایسا نہ کرنا جو میری جسمانی شخصیت سے متعلق ہو ـــ آخر تم کو ان باتوں سے کیا سروکار ہے؟

میرے خیالات میں تضاد سہی۔ مگر تمھارے اصول میں بھی یگانگت نہیں پائی جاتی۔ یہ کہہ دینے کے بعد کہ محبت اکتسابی شئے نہیں، تم مجھ کو مشورہ دیتے ہو کہ کسی سے دل لگا کر محبت کی اصلی شعریت سے لطف حاصل کروں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے معلوم ہوتا ہے کہ عملی زندگی سے ابھی تم کو بھی واسطہ نہیں پڑا۔ اور نہیں جانتے کہ دل لگا کے اور دل کے لگ جانے میں کیا

فرق ہے۔ خیر تمہارا یہ قصور قابل درگذر ہے۔ مگر آئندہ احتیاط رہے۔

مجھے یہ اختیار کسی طرح نہیں مل سکتا کہ میں ایک دوسرے نام سے تم کو مخاطب کروں۔ یہ حق صرف اس ہستی کے لئے مخصوص ہے جس کی زلفیں تمہارے بازوؤں پر منتشر ہونے کے لئے موزوں ہوں۔ لیکن یہ سن کر شاید تم کو تعجب ہوگا کہ میرا اصل نام بھی وہ نہیں جو اب تک تمہیں معلوم ہے۔ یہ عموماً ہوتا ہے کہ ارباب علم اپنی ادبی کاوشوں کو ایک فرضی نام سے پیش کرتے ہیں ــــــ کیا سمجھے ؟

تمہارے افسانوں کا مجموعہ! نہیں وہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ ممکن ہو سکے تو ایک جلد بذریعہ وی۔ پی روانہ کر دو۔ میں قیمت ادا کر کے وصول کر لوں گی۔ مگر پھر بھی اپنے دستخط ضرور ثبت کر دینا تاکہ یادگار قائم رہے۔

جواب کی منتظر

رتن بائی

خط کی دلآویزی انداز بیان سے ظاہر تھی۔ ایک ایک جملہ عمق قلب میں اتر گیا۔ میں نے زیادہ دیر تک سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ فوراً قلم اٹھا کر خط لکھنا شروع کیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس دفعہ مضمون خط میں میرے جذبات کو بھی دخل حاصل تھا :۔

میری پیاری رتن!

خوش رہو۔ مجھے غم و اندوہ بخشنے کے لئے آرام و چین سے زندگی بسر کرو ۔ مجھے مصائب و آلام میں مبتلا کرنے کے لئے ہنسو اور خوب ہنسو، مجھے خون کے آنسو رلانے کے لئے بقید حیات رہو۔ مجھے تلخیٔ مرگ سے لذت آشنا کرنے کے لئے —— کیونکہ یہی زندگی ہے، اور یہی زندگی کا تمہارے مقصود میں نے سلسلۂ مراسلت شروع کیا تھا، محض داد سخن دینے کے لئے تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے۔ لیکن چونکہ اس سے قبل تمہارے مضامین کا گہرا اثر میرے دل و دماغ پر طاری تھا۔ اس لئے احساسات کی دنیا ہی بدل گئی ۔گویا نقوش پہلے سے مرتسم تھے، اب تم نے ان کو ابھار کر نمایاں کر دیا۔ اس کیف نا تمام کی تکمیل تمہارے ہاتھ ہے تم مجھے شوخ نگار بتاتی ہو حالانکہ شوخ فطرتی تمہاری زندگی کا ایک جزو ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہارے پاس ایک شان استغنا ہے اور میرے ہاں ایک آرزوئے سپردگی ۔ میری استفسارات کا جواب جس ادائے خاص کے ساتھ دیا گیا ہے اس کے لطف بیاں پر جان و دل صدقے کر دینے کے بعد بھی سبک دوشی خراج ممکن نہیں۔ تم نے کچھ نہ بتاتے ہوئے گویا سب کچھ بتا دیا۔ اب جب کہ تم زندگی کے اس دور سے گذر رہی ہو جس کی منزل اول میں قدم رکھتے ہی تبادلہ صہبا کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ تم اپنے قلب کی دھڑکن نبض کی حرکت اور نفس کے ہیجان میں تسکین پیدا کرنے کے

ذرائع تلاش نہیں کرتیں ۔کیوں نہ ایسا ہو کہ تمہارے بستر پر کچھ سلوٹیں پیدا کرنے کا تھوڑا سا حق میرے بھی آمادہ جنبش اعضا کو مل جائے ۔ مجھے کس قدر خوشی ہوئی کہ تم کسی ایک کو اپنا بنانے کے لئے ابھی تک کسی کی نہیں بنی ہو ۔
اختلاف مذہب وملت کی قیود کو دل میں جاگزیں نہ ہونے دینا مذہب نام ہے خود انسان کے قائم کئے ہوئے چند عقائد ذہنی کا لوگ اس کو آئین سماوی کہتے ہیں اور میں سماج کی ایک زبردست کمزوری سے تعبیر کرتا ہوں ۔ آؤ ان زنجیروں کو توڑ کر ہم دوئی کے جھگڑے کو مٹا دیں ۔جب ہم دونوں کے قلوب کی دھڑکن ایک ہی نوع کی صدا رکھتی ہے تو کیوں نہ ان کو ہم آہنگ کر دیا جائے ۔ غالباً تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو ۔ اور اگر نہیں تو واضح طور پر کہے دیتا ہوں کہ آج سے میں تم کو اپنا سمجھنے لگا ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ میرا یہ بے باکانہ اظہار ناگوار خاطر نہیں ہوگا ۔کیونکہ یہ نتیجہ ہے ان شعلہ ہائے آتش کی ارتعاش انگیزیوں کا جنھیں خود تم نے میرے سینہ میں روشن کیا ہے ——— کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ——— بولو ۔ رتن ۔ میری پیاری رتن جوابڈ ۔ فی الحال میری ایک درخواست ہے اور وہ یہ کہ تمہیں میری آرزوؤں کی قسم اپنے پیکر حیات کو کاغذی پیرہن میں ملفوف کر کے میرے پاس بھیجدو ۔ میں تمہاری تصویر اس لئے حاصل کرنا نہیں چاہتا کہ اس کو دیکھ کر تمہارے حسن ظاہری

کا اندازہ لگا سکوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو جذبات کی تنگ نظری ہے۔ جو مسلک عشق میں روا نہیں۔ علاوہ ازیں حسن ظاہری سریع الزوال ہوتا ہے اور اس کی رعنائیاں گریز پا۔ پھر جس شئے کو خود ثبات حاصل نہ ہو۔ اس پر اپنی تمناؤں کے نقوش کندہ کر کے استقرار وجود کی تمنا رکھنا سراسر غلطی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ عارضی طور پر تمھاری تصویر ہی کی جلوہ فرمائیوں سے اپنے قلب مضطر کو تسکین دے لیا کروں۔ یا اگر تمھارا غرور عز و ناز تم کو اجازت دے تو کسی جگہ شرف ملاقات کا موقع دو۔ کیوں رتن! کیا تم مجھ سے ملنا پسند کرو گی؟

تمہارے دیدار کا متمنی

انجم جمالی

دل لگی ہی دل لگی میں دل کی لگی ہو گئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ قہقہوں کا انجام بھی سوزش قلب کے آغوش میں ہو سکتا ہے۔ پہلا خط لکھنے کے وقت میں یہ نہ جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ محبت کی شکل میں برآمد ہوگا۔ سب سے زیادہ جذبات میں برانگیختگی اس وقت ہوئی جب مجھے اس امر کا علم ہوا کہ ابھی رتن کے چمن حسن کا کوئی گل چین پیدا نہیں ہوا ورنہ اگر وہ دوشیزگی کی حدود طے کر چکی ہوتی تو یہی امر قاطع امید بن جاتا۔ کیونکہ دل کو صبر دے لیتا کہ شریف ہندو خاتون ایک مرد کی ہو جانے کے بعد دوسرے شخص کے لیے آسودگی آغوش نہیں بن سکتی۔ رتن بائی کے جواب بھی یہ یقین دلا رہے تھے کہ غالباً خود اس کی توجہ بھی پہلے سے میری طرف منعطف ہے۔ لیکن مندرجہ بالا خط کا

جو جواب آیا اس سے میری روح کو ایسا صدمہ شدید پہنچا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا لکھا تھا :-

جمالی !

میں سمجھتی تھی کہ تمہاری تمام باتیں معصومیت سے لبریز ہوتی ہیں لیکن پیش نظر خط سے میرے توقعات کی دنیا بدل گئی۔ تم نے خوب دل کھول کر اظہار عشق کیا۔ برا کیا۔ تمہاری یہ جسارت میرے لئے نہ صرف ناگوار خاطر ہے بلکہ بڑی حد تک میرے جذبۂ نسائیت کی توہین بھی۔ میں محبت کا احترام کرتی ہوں۔ لیکن صرف محبت کی حد تک۔ تم اس سے زیادہ کے متمنی ہو میری آرزو ہے کہ اس جذبہ کو زیادہ سے زیادہ دیرپا بنایا جائے۔ تم چاہتے ہو کہ پختگی کو پہنچنے سے قبل ہی اس کو مائل بہ زوال کر دیا جائے بالفاظ دیگر میں چاہتی ہوں کہ کلیاں پھولوں کے دور حیات تک شاداب ہیں تم چاہتے ہو کہ شگوفہ بننے سے قبل ہی ان کو ل کر پامال کر دیا جائے۔ اسی لئے میں اپنی شادی کے خلاف ہوں۔ چاہتی ہوں کہ دو شیزگی کی نغمہ پرور کیفیات عرصہ دراز تک میری روح پر طاری رہیں۔ میرا عزم راسخ ہے۔ میں یقیناً اس پر کاربند رہوں گی۔ کیونکہ "میرا دعویٰ ہے کہ میں دنیا میں ایک شاعرانہ زندگی گذارنے آئی ہوں[۱]" میں جنس قوی کی معیت سے متنفر نہیں مگر اس کی حریفانہ لغزشوں سے بخوبی محسوس کر لینے کے

---

[۱] اس جملہ کی ترکیب کیلئے اپنے ایک دوست سے معافی کا خواستگار ہوں۔ ف۔ح۔ق

باعث اس سے اجتناب ضروری سمجھتی ہوں۔ مرد بہت زیادہ خود غرض اور نفس پرور ہوتے ہیں۔ وہ لطیف جذبات کی نزاکت کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی خواہشات کی اہرمنی قوتوں سے نسوانی شعریت و الوہیت کا خون کر دیتے ہیں۔ ان کی تخلیق تو ایک ایسی فضا میں ہونی چاہیئے تھی۔ جہاں نہ شفق کی رنگینی ہوتی نہ پھولوں کی نکہت نہ چاندنی کی ضیا ہوتی نہ شبنم کی طراوت، نہ پرندوں کا ترنم ہوتا نہ چشموں کی لطافت۔ بلکہ ایک ویران جنگل، سبزی و شادابی سے معرا، رنگینی و طراوت سے خالی، نور و نکہت سے بے نیاز، البتہ ایک ایسی ہستی بھی ان کے سپرد کر دی جاتی جس کی جسمانی ساخت تسکینِ خواہشات کے ضمن میں عورت سے مشابہ ہوتی۔ پھر یہ مرد —— غیر شاعرانہ ذہنیت رکھنے والا مرد —— قسامِ ازل سے کسی دوسری شے کا طالب نہ ہوتا۔

تم مجھ سے میری تصویر طلب کرتے ہو۔ آخر کیوں؟ مسلمان ہو۔ ہر وسیلے سے بے نیاز ہو کر بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہونے کی تعلیم تم کو دی گئی ہے۔ اس فلسفہ مذہب کو اپنا ایمان سمجھو۔ کاغذی یا سنگین بت کو سامنے رکھ کر شاہد مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرنا وسعتِ خیال نہیں تنگ نظری ہے۔ حصولِ مقاصد کے اس طریقۂ کار کو ترک کر دیا۔

اگر تم کو مجھ سے واقعی محبت ہے تو میں اس ستائش کے لئے شکر گذار ہوں۔ مگر مجھ سے تصویر طلب نہ کرو۔ بلکہ اپنے تصورات کو اس قدر تکمیل دو کہ خود تمہارا ذہن رسا میرے حقیقی پیکر کو تخلیق کر لے

اور کائنات کی لامحدود فضا میں سوائے میرے کوئی دوسری شے تم محسوس نہ کر سکو۔ میرے جلووں کے علاوہ تم کو کچھ نہ دکھائی دے صرف میرے ہی نغمے تمہاری سامعہ پر اثر انداز ہو سکیں۔ تم میری تصویر کو سامنے رکھ کر اظہارِ جذبات کرو گے۔ لیکن میں نہ تمہاری گفتگو کو سن سکوں گی، نہ تمہارے چہرے کی رنگت دیکھ سکوں گی تم اپنے خیالات میں ایک کشش پیدا کرو۔ مجھے اس قدر یاد کرو کہ خود میں تم کو یاد کرنے کے لئے مجبور ہو جاؤں۔ اگر تمہارے دل کا سوز اتنا بھی نہیں کہ اس کی تپش سے میرا جسم جل اٹھے تو دعوئ محبت غلط ہے۔ تم ایک ایسے مغنی بن جاؤ۔ جو مضراب کو جنبش دئے بغیر تاروں میں ارتعاش پیدا کر سکتا ہو۔ تم اپنے ترنم خاموش سے تمام فضا میں ایک ایسا سکوت نغمہ پیدا کر دو۔ جو کسی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ مگر میں اور صرف میں ——— ان کو سمجھ کر سننے کے لئے اور اس کی داد دینے کے لئے مجبور ہو جاؤں۔

تم سلسلۂ مراسلات کو جاری رکھنا اور ضرور جاری رکھنا لیکن یہ ملحوظ رہے کہ میرے جذبہ نسائیت یا احساس شعریت کو کوئی صدمہ نہ پہنچے، جواب کی منتظر

رتن بائی

میں نے اس خط سے کیا اثر لیا میرے جواب سے ظاہر ہے جو میں نے اولین فرصت میں رقم کیا :-

معصوم شاعرہ! خوش رہو۔

تمہارا گرامی نامہ جو ایک شاعر کا دیوان اور

واعظ کے دفتر پند و نصائح سے کم نہیں، اس وقت پہنچا جب کہ میں بطور یاد دہانی دوسرا خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ اگرچہ خط کے ہر جملہ سے بے نیازی ظاہر، جملہ کے ہر لفظ سے شانِ استغنا واضح اور لفظ کے ہر حرف سے غرورِ حسن ٹپک رہا ہے۔ مگر پھر بھی اس میں سے بوئے محبت آتی ہے اور صرف اسی احساس نے مجھے اب تک بقیدِ حیات رکھا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم ابھی کمسن ہو، عملی زندگی سے ابھی واسطہ نہیں پڑا۔ ورنہ اس شاعرانہ موشگافیوں سے احتراز کرتیں۔ جو اصول کی حد تک رنگین ہیں اور اصول وہی قابلِ قدر ہوتے ہیں جو دائرہ عمل میں نہ آسکیں۔ لیکن جیسا کہ تمہارے ایک خط سے پتہ لگ گیا ہے، وہ وقت قریب ہے جب کہ احساسِ شباب تمہاری شعریت و نسائیت پر غالب آجائے گا۔ اس وقت میں تم سے پوچھوں گا کہ تم اس دنیا میں شاعرانہ زندگی گذارنے آئی ہو یا ایک آرزدۂ سپردگی کے ساتھ کسی کی حد درجہ غیر شاعرانہ خلوتوں میں بالکل مجرمانہ طور پر ایک سہما ہوا سانس لینے۔ تم مرد کی حریصانہ لغزشوں سے خائف ہو کہ وہ لطیف جذبات کی نزاکت کا خیال نہ رکھتے ہوئے اپنی خواہشات کی اہرمنی قوتوں سے نسوانی شعریت و الوہیت کا خون کر دیتے ہیں۔ بجا ارشاد ہوا۔ لیکن خدا را مجھے یہ تو بتاؤ کہ عزیزِ مصر کے قصرات کی فضا میں یوسف کا دامن کس کی حریصانہ انگلیوں سے کھنچا تھا؟ اور رودِ نیل کی موسیقیت سے لبریز لہروں پر لنگرانداز ہو کر حسن کی کرشمہ سازیوں سے انطونی کو

وارفتۂ تخیل کرکے سلطنت روما کو غیر شاعرانہ حد تک تنزل کر دینے والی ہستی کس صنف سے تعلق رکھتی تھی ؟ اسی طرح کسی ملک کی تاریخ ایسے واقعات سے خالی نہیں - اگر تمہارے اندر ذوق تجسس ہے تو میرے بغیر کہے ان کو سن لو اور پھر فیصلہ کرو کہ جو غیر شاعرانہ ماحول تم نے جنس قوی کے لئے تجویز کیا ہے . وہ صنف نازک کے لیے بھی کس حد تک موزوں ہے اگر عورت کی فطرت میں شعریت والوہیت ہوتی تو اس کی ترغیب پر غیب آدم کو جنت کی پر امن فضا سے جلا وطن ہونا نہ پڑتا اور میں تم سے بھی پوچھوں گا کہ اگر شاعرانہ زندگی ہی بسر کرنی تھی تو مخلوق سماوی کے ساتھ تاروں کی نکہت بار فضا میں کیوں نہ قیام کیا

کہ کشیدہ دامن فطرت کہ میان دمن آمدی ؛ تو بہار عالم دیگری تو کجا بایں چمن آمدی

بیشک میرے مذہب نے مجھے سکھایا ہے کہ بغیر کسی وسیط کے بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو جاؤ لیکن محبت کے ہاتھوں اب تو تمہارا مذہب میرا مذہب ہے، تمہارا دین میرا دین ہے - اسی لئے بت پرستی کو میں نے اپنا شعار بنا لیا کیونکہ تم بھی بت پرست ہو - کیوں رنج ! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟ میرا خیال ہے کہ تم کو تصویر بھیجے میں اب کوئی عذر نہ ہوگا !

اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو موسیقی سے بھی کچھ ذوق ہے یا نہیں ؟

تمہارے پیمانہ نسائیت کو بادۂ شعریت سے لبریز دیکھنے کا متمنی

انجم جمالی

میں سمجھتا تھا کہ رتن بائی اس خط کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے گی مگر اس کی ادیبانہ شان مجھ سے بازی لے گئی۔ ہر چند اس کی باتیں ضد اور ہٹ پر مبنی تھیں ——— مگر طرز ادا دلربائی کی حد تک حسین تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے میرے دل کو موہ لیا تھا۔ درحقیقت مجھے اس کے ادبی نقوش سے محبت تھی:۔

وارفتۂ تخیل!

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم کسی چیز کا مطالعہ بنظر غائر نہیں کرتے۔ تمہارے خیال کی وسعت صرف سطح سمندر پر تڑپنے والی موجوں اور ان موجوں کے ساتھ بہنے والے خس وخاشاک تک محدود ہے اور میرا ذوق تجسس اس اضطراب پیہم کے عمق میں بھی کامل سکون وطمانیت کے گہوارہ کے اندر پرورش پانے والے صدف کے شکم سے گوہر بے بہا نکال لینے کا آرزو مند۔ بدیہی چیزیں بھی اکثر سراب ہوتی ہیں اور اسی لئے تم ہر قسم کے فریب میں مبتلا ہو۔ تم پھول کی رنگینی کو دیکھتے ہو اس کی نکہت سے لطف اٹھاتے ہو اور بس۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہوں اگر رنگینی اور نکہت کو پھولوں سے جدا کر کے ان میں شبنم کی تھوڑی سی طراوت بھی کسی طرح ملا دی جائے تو ان کے امتزاج باہمی سے کس نوع کا تلذذ حاصل ہوگا۔

خالق حقیقی نے آدم کے جزو بدن سے حوا کو پیدا کیا تھا۔ لہٰذا نسویت تباہ ہوگئی۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر حوا کے جزو بدن سے آدم کو پید

کیا جاتا تو صورت واقعات بالکل برعکس رہتی۔ بے شک یوسف
کے دامن کو ایک عورت نے کھینچا تھا۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یوسف
سے قبل اسی عورت کے دامن کو ایک مرد کی حریصانہ خواہشات
نجس کر چکی تھیں۔ اس لئے شعریت کا فقدان تھا۔ اچھا یہ تو بتاؤ
کہ خود کو تباہ و برباد کرانے کے لئے انطونی ارض مصر میں آیا تھا
یا کلیوپیٹرا نے روم کی شعریت کو تباہ کرنے کے لئے ترک وطن
کیا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔ دوسرے
کی آنکھ کا تنکا نظر آجاتا ہے۔ صنف نازک کو برا کہنے والے نہیں
سمجھتے کہ خود ان کی جنس کس قدر قابل نفریں ہے کیوں جمالی!
تم بھی کچھ سمجھے یا نہیں؟

تم میرے خیالات کو شاعرانہ تعلیوں سے تعبیر کرو یا جو جی چاہے
سمجھو، مگر میں ان پر جان دیتی ہوں۔ میری روح کی تسکین انہیں
میں مضمر ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ شعریت ذہن انسانی پر ہمیشہ
مستولی رہتی ہے۔ ہر چیز کے لئے زوال لابد ہے ؎

مجھے معلوم ہے جو حسن کا انجام ہوتا ہے   مری آنکھوں نے دیکھا ہے عروج ماہ تاباں کو

میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ عملی زندگی کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں
ایک نہ ایک دن ہر شخص کو گرنا ہوتا ہے۔ انسان کے مقاصد حیات
میں یہ چیز ضرور شامل ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ رتن بائی بھی
باقتضائے شباب کسی نوجوان کی زینت آغوش بننے کے لئے
آسانی سے مجبور ہو جائے اور خود اپنے ہاتھوں اپنے جسم کی
شعریت اور روح کی الوہیت کو تباہ کرلے۔ تاہم خدانخواستہ

اگر ایسا ہوا بھی کہ میرے ملند آہنگ دعوے باطل ہو گئے اور میں نے اپنے نصب العین کی تکمیل میں ناکامیاب رہ کر ہار مان لی تو پھر بھی وہ میری زندگی کا آخری حصہ ہوگا۔ میرے عہدِ شباب کے زرین دور کو جنسِ قوی کی دست درازیاں کبھی پامال نہیں کر سکتیں۔ میں اس کے تحفظ میں جان تک دیدینا گوارا کرلوں گی۔

کیوں جمالی! تم میری محبت کی خاطر اپنے مذہبی عقائد کو ٹھکرا کر بتوں کی ہیکل گلے میں ڈال لینا باعثِ فخر سمجھتے ہو۔ آخر کیوں مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس سے زیادہ زرین شے کو حاصل کرنے کی غرض سے کہیں محبت کو قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہو جاؤ۔ بتاؤ! میں تمہارے جذبات کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھوں؟ انسان کو چاہیئے کہ لوہا نہ بنے بلکہ خود اپنے اندر مقناطیسی کشش پیدا کرے۔ کسی شے کی طرف کھنچ جانے میں وہ لطف کہاں جو دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچ لینے میں ہے مادرِ گیتی نے سب سے پہلا سبق ہمیں یہی دیا ہے۔ میری خاطر اپنے دھرم کو نہ چھوڑو بلکہ کوشش کرو کہ خود میں تمہاری ہم مذہب ہو جاؤں۔ مجھے موسیقی سے ذوق ہی نہیں بلکہ وہ میرے روزانہ انہماک کا بہترین جزو ہے۔ رات کے آخری پہر سے طلوعِ آفتاب تک میں اسی شغل میں رہتی ہوں لیکن کوئی دوسری ہستی اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی میرے نغموں کی دنیا صرف میرے ہی وجود تک محدود ہے۔ لیکن تم کو ان شاعرانہ باتوں سے کیا سروکار

یہ تو کچھ ہم ہی لوگوں کے لئے موزوں ہیں۔

جواب کی منتظر
رتن بائی

اس کے بہت عرصہ تک ہم دونوں کے درمیان سلسلہ مراسلت جاری رہا مگر رفتہ رفتہ وہ رنگینی کم ہوتی گئی۔ محض الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ وہی پرانی باتیں لکھی جانے لگیں۔ جن میں فرسودگی کے باعث کوئی مخصوص جاذبیت باقی نہ رہی۔ ادھر میں نے یہ سوچا کہ جس چیز کا کوئی نصب العین نہ ہو، اسے اختیار کرنے سے کیا حاصل؟ رتن بائی نے مضامین لکھنے ترک کر دئے تھے جس کا سبب باوجود دریافت کرنے کے کچھ نہ بتایا گیا۔ وہ عموماً میرے دریافت طلب امور کو ٹال دیتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کے خطوں سے کسی قدر بے التفاتی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ میری طرف سے کھنچ رہی تھی۔ غرض یہ کہ دونوں طرف سے بے توجہی اور ایک حد تک مغائرت کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہم ایک دوسرے سے ناواقف ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ہم دونوں کا بُعد ناقابلِ عبور ہو گیا۔ وہ مجھے بھول چکی تھی میں نے اسے.... فراموش کر دیا۔

انہی دنوں میں فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس چلا گیا۔ چونکہ والد لاٹ صاحب کے دفتر میں ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر مجھے ایک معقول اسامی مل گئی۔ برسرِ روزگار ہونا تھا کہ گھر والوں کو شادی کی فکر ہوئی۔ ہر چند میں نے مخالفت شروع کی مگر والد کا اصرار مجبور کرنے

لگا۔ چنانچہ اِدھراُدھر رقعے بھیجے گئے۔ تحقیقات کی گئی۔ مگر کوئی رشتہ سمجھ میں نہ آیا۔ میں چاہتا تھا کہ لڑکی ایک عمدہ ادیبہ کی حد تک تعلیمیافتہ ہو حسین ہو یا نہ ہو شریف النفس ضرور ہو۔ شعر و موسیقی سے شغف رکھتی ہو۔

معاملہ ابھی لیت و لعل ہی میں تھا کہ والد صاحب کے ایک دوست لاہور سے تبدیل ہو کر دہلی آگئے۔ چونکہ تعلقات دیرینہ تھے اور کچھ رسم بھی تھی۔ اس لئے ایک روز دعوت طعام کے لئے ان کو مع جملہ عزیزان کے مدعو کیا گیا ظہیر خوش اخلاق اور با وضع آدمی تھے۔ مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی وہ ان آدمیوں میں سے تھے جو بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اتوار کا دن تھا، فرصت بھی اس لئے سارا دن ان سے شطرنج کھیلنے میں گذرا۔ بر سبیل تذکرہ روزمرہ کے گوناگوں پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ نوجوان ادیبوں میں انھیں انجم جمالی کا طرز تحریر...... بہت پسند تھا۔ لیکن اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا شمیم ہی انجم جمالی کے نقاب میں رقم طراز ہوتا ہے، یہ راز خود میرے والد پر بھی منکشف نہ تھا۔

ان کے رخصت ہو جانے کے بعد جب مجھے زنانہ حصہ مکان میں جانے کا موقع ملا تو ہمشیرہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ظہیر صاحب کی صاحبزادی نے اپنی وضع قطع اور عادات و اطوار سے والدہ کا دل موہ لیا ہے۔ "صابرہ خاتون جوان اور خوب صورت ہے" اس کے علاوہ مجھے کچھ نہ بتایا گیا۔ جو یقیناً میرے لئے ناکافی تھا۔ دوسرے لوگ بھی لاعلم تھے۔ مگر مزید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صابرہ نے گذشتہ سال ہی منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی ہے اور چند فنون لطیفہ میں بڑی ماہر ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کس چیز کی ضرورت تھی چنانچہ اپنی رضامندی ظاہر کی۔ یہی دو عناصر ایسے ہیں جو مجھے ایک عورت کی پرستش کرنے

کے لئے مجبور کرسکتے ہیں۔ علم و ادب، اور فنون لطیفہ۔

شادی کا پیغام بھیجا گیا جو ظہیر صاحب نے معمولی پس و پیش کے بعد قبول کرلیا چنانچہ اس کارِ خیر کا اہتمام دونوں طرف سے شروع ہو گیا۔ لیکن مجھے جس قدر خوشی ہو رہی تھی اتنا ہی رنج بھی تھا۔ ہر چند خط و کتابت کا سلسلہ جاری نہیں تھا مگر پھر بھی رتن بائی کی یاد میرے لئے سوہانِ روح تھی۔ رہ رہ کر اس کے فلسفیانہ خیالات اور اس کی ادیبانہ شان لوحِ قلب پر اتر رہی تھی۔ عرصہ تک میرے تخیلات کے مندر میں اس نے ایک مقدس دیوی کی حیثیت سے جلوہ فرمائی کی تھی۔ فراموش کر دینے کے بعد بھی اس کو بھلا دینا مشکل تھا ؂

الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے
بھلاتے ہیں انھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

خاص طور پر شادی سے ایک روز قبل میرے قلب کی کیفیت عجیب تھی میں نے سنسان رات کے خاموش سناٹے میں رتن بائی کے تمام خطوط میز کی دراز سے نکالے۔ ایک ایک سطر کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد ان سب کو چاک کرکے نذرِ آتش کر دیا۔ ہر چند میرا یہ فعل مستحسن نہیں تھا مگر مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ایک شریکِ حیات کی موجودگی میں کسی دوسری ہستی کے نقوشِ محبت کو اپنے محفوظات میں شامل رکھوں۔ صبح ہونے تک میری طبیعت بہت زیادہ مکدر ہو گئی۔ کیونکہ وفورِ جوش میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اگر کچھ دیر رو لیتا تو دل کی بھڑاس نکل جاتی۔

خیر شادی ہو گئی اور میں صابرہ خاتون کے ساتھ عیش و نشاط کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ہماری خلوت کے بیشتر لمحے ادبی گفتگو میں صرف ہوتے تھے۔ بسا اوقات کسی شعر کے مطالب و مفہوم پر بحث و تمحیص بھی ہوتی۔ کبھی وہ ہار جاتی اور کبھی مجھ کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑتا۔ میری طرح وہ بھی غالب کی بڑی مداح

تھی۔ اور حافظ کے صدہا شعر زبانی یاد تھے۔ اکثر برسات کی سہانی راتوں میں اسکی نازک انگلیاں ہارمونیم کے پردوں پر رقص کرتیں۔ اور میں بیلے کے ساتھ مضراب بر ساز ہوتا۔ وہ مجھ سے زیادہ بہتر گانا جانتی تھی۔ کیونکہ میرے پاس نسوانی گلے کا شیریں لوچ نہیں تھا۔ لیکن غرور و نخوت کے زعم باطل میں اس نے کبھی برتری کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ صدق دل سے میرا احترام کرتی۔ اور حقیقی معنوں میں اپنا سر تاج تصور کرتی تھی۔ ہماری مشترکہ زندگی دوسروں کی نظر میں بھی رشک کی حد تک خوشگوار تھی۔

میرے ساتھ اس کے اندر بھی مضمون نگاری کا شوق پیدا ہو گیا۔ لیکن سب سے پہلے افسانہ کا مطالعہ کرکے میں نے رائے قائم کی کہ وہ ایک کہنہ مشق ادیب ہے۔ ہماری کاوشیں مشترکہ طور پر قارئین رسائل کے سامنے پیش ہونے لگیں۔ میں افسانہ لکھتا اور وہ ایک سرسری نظر ڈالتی۔ یا وہ افسانہ لکھتی اور میں ایک سرسری نظر ڈال لیتا۔ مگر تمام افسانے اور مضامین صابرہ شمیم کے نام سے شائع ہوتے۔ بعض اوقات میں سوچتا رہ جاتا کہ اگر رتن بائی میری طرف ملتفت ہو کر مصروف عمل ہو جاتی تو شاید ہمارے مضامین وغیرہ رتن جمالی کے مشترکہ نام سے شائع ہوتے۔ لیکن یہ ایک آرزو تھی انتہائی دلکش۔ دلکش اس لئے کہ پامال ہو چکی تھی۔

شادی کے تقریباً دو سال بعد کا ذکر ہے کہ دہلی کی شدید گرمی سے اکتا کر ہم نے سوچا کہ عارضی طور پر کسی پہاڑی مقام پہ منتقل ہو جانا چاہیئے۔ نظر انتخاب ارض کشمیر کی طرف اٹھی اور فیصلہ کر لیا کہ بلاشک اس سے زیادہ بہتر ماحول دوسری جگہ نصیب ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا اور بقول صابرہ

خاتون تن ہم جلدی ہی ایک شاعرانہ مقام کی موسیقیت سے لبریز فضا میں سانس لینے لگے۔

سری نگر میں جھیل ڈل کے کنارے ہم نے ایک چھوٹی سی کشتی میں قیام کیا۔ وہ ہم دونوں کی رہائش کے لئے کافی تھی۔ سیماب آسا تڑپنے والی سطح آب نیلگوں اطلس کی چادر آسمان درختوں کی قبا سے زمردیں، مختلف الالوان پھولوں کے تختے رنگ برنگ کے پرندے۔ کچھ فاصلہ پر برف پوش چوٹیاں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور ان سب سے زیادہ سرشام جب کہ ہفت اقلیم کی دیویاں افق مغرب میں جمع ہوکر ہولی کھیلتی ہیں۔ دوشیزگانِ کشمیر کا پھولوں کے گجرے پہن کر سرخ ساریوں میں ملبوس ملحقہ باغوں کی روشوں پر محو خرام ہونا۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کی کرشمہ سازیوں سے اس مقام کی تمام فضا نکہت وصباحت لطافت و رنگینی، نور و نزاکت، ترنم و موسیقی، رقص و سرود ارضی شعریت و سماوی الوہیت سے ہر وقت معمور رہتی ہے منظر کشی کے لئے کیمرہ ہمارے ساتھ تھا۔ تاکہ ہر گوشہ چمن سے کیفیاتِ قدرت کی تسخیر کر سکیں۔ مگر اس طرح کہ ہر تصویر میں شامل ہونے کے لئے میں یا صابرہ کیمرہ کے سامنے آکر کائنات کو پس منظر میں لے لیتے محض اس لئے کہ ہمارے سفر کی یادگار قائم ہو سکے۔

ایک دن جب کہ ہم نشاط باغ میں ٹہل رہے تھے۔ صابرہ خاتون بارہ دری کی شاہی نشست گاہ پر جا بیٹھی اور مجھ سے کہا کہ یہ فرض کر کے تصویر کھینچو گویا میں نور جہاں ہوں اور تم جہانگیر۔ کتنا حسین تخیل تھا کہ میں کیمرہ کی کھٹکی دبانے سے قبل اس کے لبوں پر ایک مہر الفت ثبت کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی کسی کی یاد مجھے ستانے لگی —

رتن بائی اف رتن بائی! ـــــ اگر اس موقع پر وہ موجود ہوتی تو اس کی شاعرانہ طبیعت خدا جانے کس کس انداز سے معجز بیان ہوتی ہر چند میں محسوس کرتا تھا کہ صابرہ اس کا بہترین نعم البدل ہے۔ لیکن پھر بھی اسکا ہر وقت کا قرب زندگی کو یک رنگ بنا دیتا تھا۔ جب تک فراق کے پرسوز لمحے نہ ہوں حقیقی لطافت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ صابرہ نے مجھ سے کئی بار کہا کہ وطن واپس چل کر اس سفر کے دلچسپ کوائف کو بہت رنگین زبان میں قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے۔ مگر مجھے یہ تجویز ناپسند تھی۔ حقیقت میں رومان پیدا کرنے کی کوشش تاریکی میں روشنی کی تلاش کے مترادف ہے۔ چنانچہ اسی اختلاف پر ہم دونوں میں کئی مرتبہ معمولی چپقلش بھی ہو گئی۔

ایک روز دوپہر میں کچھ زیادہ دیر سو لینے کی وجہ سے کافی دیر تک ہمیں نیند نہ آئی۔ اس لئے کشتی کے کھلے حصہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ـــــ آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ چاند کی روشنی تمام سطح آب پر چھٹکی ہوئی تھی۔ کائنات کا ہر ذرہ اکتساب نور کر کے چمک اٹھا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں بھی ایک شوخ حسینہ کی طرح اٹکھیلیاں کرنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ چاندنی رات، دریا یا جھیل کا کنارہ، چھوٹی سی کشتی، شعر و موسیقی اور ان سب سے زیادہ ایک نسوانی پیکر آغوش میں ہو اور بس۔ صابرہ کی زلفیں منتشر ہو ہو کر بازوؤں پر بکھر رہی تھیں اور ساڑی کے پلو بار بار سرک کر سینے کو عریاں کئے دیتے تھے۔ اس کی ہر چیز میری اور صرف میری ملکیت تھی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے جائز چیزیں بھی ناجائز ہو کر رہ جائیں۔ میں اپنے

نفس پر جبر کیئے بیٹھا تھا کہ انضباط جذبات کی کیفیات سے بخوبی لطف اندوز ہو سکوں۔ مگر اس کے جسم کی مقناطیسی قوتیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور میں ایک خواب بیداری کے دیکھنے میں محو ہو گیا تھا کہ اچانک اس نے میرے انہماک کو توڑ دیا۔ وہ کہنے لگی۔

"آسمان کی طرف تکتے تکتے میری گردن میں درد ہونے لگا ہے۔ میں لیٹ جاتی ہوں اور تم بھی میرے قریب لیٹ جاؤ۔ لیکن خبردار! کسی قسم کی غیر شاعرانہ دست درازی نہ کرنا۔ آج کی سہانی رات میں نیند کی کیفیات طاری ہونے سے قبل میرے جسم کے کسی حصہ کو چھونا تمہارے لیئے ناجائز ہے۔ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو میں بگڑ جاؤں گی ——— سنا تم نے؟"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہی بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور نظر جما کر قدرت کی لامحدود فضا میں رقص کرنے والی آسمان کی غیر مرئی مخلوق سے ہمکلام ہوتے ہوئے گنگنانے لگی۔ کائنات کا ہر ذرہ اس سے ہم آہنگ ہو کر داد موسیقی دینے لگا۔ اس وقت مجھے جگر کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موج دریا ٹھہر گئی ہے
سکوت نغمہ بنا ہوا ہے وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں

میری روح کی خوابیدہ حسرتیں ایک ایک کر کے بیدار ہونے لگیں میں نے آرزو کی کہ اپنے وجود کو ایک رباب کی شکل میں تبدیل کر کے اس کے ان ہاتھوں میں پہنچا دوں جو خاموش نغموں کو تال دینے کے لیئے چٹکی بجانے میں مصروف تھے۔ مگر اس کی برہمی کے خیال سے ہمت نہ پڑی اور صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا۔

"میری جان! ذرا اونچے سروں میں گاؤ تاکہ میں بھی تمہارے لحن عبودیت سے لطف اندوز ہوسکوں۔"

"اوہنہ!" اس نے گردن موڑتے ہوئے کہا "پھر کسی وقت دیکھا جائے گا فی الحال میں اپنے ہی نفس کو محظوظ کرنا چاہتی ہوں، تم بھی الگ لیٹ کر کیوں نہیں گنگنانے لگتے؟"

عین اس وقت مجھے کچھ دل لگی سوجھی اور فوراً تال اور سُر سے قطع نظر نہایت بے ہنگام آواز میں الاپنے لگا۔ اس قدر بلند آواز سے کہ قریب کے گھونسلوں میں بسیرا لینے والے کئی پرندے ڈر کر اڑ گئے۔ مجھے خود اپنی اس حرکت پر ہنسی آ گئی۔ قہقہوں سے تمام فضا گونج اٹھی۔ صابرہ تیوری پہ بل ڈال کر اٹھی اور کمرے کے اندر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور آغوش میں لے کر اس زور سے بھینچا کہ وہ سسکاریاں بھرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میرا شوق بیتابی وہ سب کچھ کرنے لگا۔ جو خلوت سے متعلق ہونے کے باعث اس سرگذشت میں قلمبند نہیں کیا جا سکتا اس نے سختی کے ساتھ میرے ہاتھ کو جھٹک دیا اور تڑپ کر پہلو سے نکل گئی ہیجانِ تنفس سے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ غصہ کے مارے تمام چہرہ تمتما اٹھا۔ آنکھیں خشمگیں، تیوری پر بل، نہایت ترشروئی سے بولی:-

"تم مرد لوگ کس قدر خود غرض ہوتے ہو۔ موقع و محل کی نزاکت کا کبھی خیال نہیں کرتے۔ نفسانی خواہشات تم کو بہت جلد مغلوب کر دیتی ہیں تم فضا کی شعریت والوہیت کا احترام نہ کرتے ہوئے اس کا خون کر ڈالتے ہو۔ غیر شاعرانہ حرکتیں تو اپنے وطن میں بھی ہو سکتی تھیں۔ پھر کشمیر آنے کا کیا مقصد ہے۔ اچھا دو روز تک مجھ سے ہمکلام ہونے کی کوشش نہ کرنا۔"

میں چونک پڑا۔ صابرہ کی برہمی مزاج سے ڈر کر نہیں بلکہ قوت متخیلہ مجھے کسی دوسری نگری میں لے گئی۔ اس نگری میں جہاں میری روح کی بیتابیاں آسودۂ خواب تھیں وہ اظہار ناراضگی کر رہی تھیں۔ مگر میں الفاظ کی کرختگی پہ توجہ نہ کرتے ہوئے اس کے صرف نفس مضمون میں کسی دوسری ہستی کا انداز تکلم محسوس کرنے لگا تھا ——— بالکل رتن بائی کے سے خیالات تھے اس کا فلسفہ حیات بھی ایسی ہی شعریت سے لبریز ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ صابرہ نے بھی ضرور رتن بائی کے ادبی مضامین کا دقیق مطالعہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ خیالات میں اس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

جب میں اپنی محویت کے استغراق سے ابھرا تو وہ کشتی کے اندرونی حصہ میں جا چکی تھی مجھے اپنی غلطی کا کچھ کچھ احساس ہوا اور اسی لئے کہ اس کو مناؤں لپک کر اس کے پیچھے گیا۔ مگر کمرے کے کواڑ اندر سے بند ہو چکے تھے اور صرف سسکیوں کی آواز باہر آرہی تھی۔ ایک محبوب ہستی کی گریہ وزاری کوئی سخت سے سخت دل انسان بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ میں سخت نادم تھا۔ میں نے اس کے معصوم جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ اف! وہ رو رہی تھی۔ بیشک مرد خود غرض اور نفس پرور ہوتے ہیں ——— ملعون مرد ——— خبیث مرد ——— میں اپنے آپ کو مطعون کرنے لگا اور اعتراف جرم کے طور پر اپنی اس کلائی پر کاٹ لیا جس نے صابرہ کی گردن میں حمائل ہونے کے لئے دست درازی کی تھی۔ لیکن یہ پاداش ناکافی تھی۔ انقباض روح کے مقابلہ میں جسمانی تکلیف کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس کا علم ہوا کہ عورت کی ذہنیت سمجھنی مرد کے لئے

دشوار ہے۔ خواہ وہ اس کی شریک حیات ہی کیوں نہ ہو۔ ازدواجی زندگی بسر کرتے ہوئے مجھے دو سال ہو گئے تھے اور صابرہ کی طبیعت سے ہنوز ناآشنا تھا۔ لہٰذا میں نے دہیں کھڑے کھڑے مصمم ارادہ کر لیا کہ اسی روز بلکہ اسی لمحہ سے اس کی ذہنیت کا مطالعہ شروع کر دینا چاہیئے۔ اس ضمن میں مجھے یہ راز معلوم تھا کہ عورت کے ساتھ جس قدر زیادہ محبت کا اظہار کیا جائے اتنا ہی وہ اپنی ہستی کو خود بے نقاب کرتی چلی جاتی ہے۔ پہلے میں نے یہ خیال کیا کہ اس کو کچھ دلاسہ دینے کے لیے کسی طرح کواڑوں کو کھول لینا چاہیئے۔ مگر پھر خاموش ہو گیا کہ ایسے وقت جب کہ اس کے جذبات برانگیختہ ہوں اس کو اسی کے حال پہ چھوڑ دینا مناسب ہے۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی نقطہ ہے کہ آنسوؤں کے بہ جانے سے دفور جوشش سرد پڑ جاتا ہے۔

دوسرے روز اس نے میرے ساتھ ناشتہ کیا نہ کھانا کھایا۔ میں نے بھی ظاہری بے رخی سے کام لیا اور کوئی بات نہیں کی۔ تمام دن وہ اپنے پلنگ پر دوشالے سے منہ ڈھانکے پڑی رہی اور میں کتاب کے ایک ہی صفحہ کا بار بار مطالعہ کرتا رہا۔ کیونکہ توجہ دوسری طرف ہونے کے باعث ایک لفظ بھی ذہن نشین نہ ہوتا تھا۔ شام کی چہل قدمی کا وقت آیا اور گذر گیا وہ لباس تبدیل کر کے باہر نہ نکلی۔ میں بھی تفریح کے لئے کہیں باہر نہ گیا۔ کیونکہ یہ کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کو تنہا چھوڑ کر خود چلا جاؤں۔ ایسی بے رنگ اور خاموش زندگی سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ میری طبیعت اکتا سنے لگی۔ اب میں مجبور ہو گیا کہ کسی طرح صابرہ کو رضامند کر لیا جائے۔

شام کا کھانا کھا کر وہ کشتی کے کنارے کھڑی ہوئی موجوں کے سنگ لہروں میں رقص کرنے والی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا خاتمہ دیکھ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں اس کے پیچھے گیا اور نارنگی کے چھلکے کو دبا کر عرق سے اس کی آنکھوں کو پر آشوب کر دیا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا — مسکرائی — پھر تیوری پر بل ڈالے اور کہا:۔

میں تم کو منع کر چکی ہوں کہ دوران گفتگو نہ کرنا۔"

"بجا ارشاد ہوا" میں نے ظاہری سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ نارنگی کے چھلکے کا نچوڑنا گفتگو کے تحت میں نہیں آسکتا جب کہ لب بھی نا آشنائے جنبش رہے ہوں"۔

"ہاں میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ یہ گفتگو نہیں مگر موضوع گفتگو ضرور ہے" اس نے ظاہری برہمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر اس بحث کو ترک کرو" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ اور مجھے اس شعر کا مطلب سمجھا دو ؂

لبوں پہ موج تبسم، نگہ میں برق غضب کوئی بتائے یہ انداز برہمی کیا ہے

اس کی ظاہری ناراضگی کا نقاب اتنا دبیز نہیں تھا کہ اس میں سے تبسم کی جھلک نمایاں نہ ہوتی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ خود صلح کر لینے کے لئے آمادہ ہے۔ مگر بات کی پچ میں خودداری مانع کلام ہے۔ میرا برمحل شعر سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ پھر اس کے آنسو بہہ نکلے اور ایک آرزوئے سپردگی کے ساتھ میری طرف بڑھی۔ میں نے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے گود میں اٹھا لیا — عورت کو منانے کا یہی بہترین طریقہ ہو سکتا ہے — میں اس کے شانہ کو

تھپک تھپک کر اس طرح پیار کرنے لگا گویا وہ ایک کمسن بچی ہے جس کو خاموش کرنے کے لئے بہلایا جا رہا ہے بہت جلد اس کے دل کا غبار اتر گیا اور وہ پہلے کی طرح ایک غنچہ بہار کی مانند بشاش و شگفتہ ہوگئی۔ اس لذت بازیافت کو وہی لوگ خوب محسوس کرسکتے ہیں جن کو اپنے کسی محبوب سے برہم ہو جانے کے بعد صلح کر لینے کا موقع نصیب ہوا ہو ؎

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہوکر

اس کے بعد وہ بڑی دیر تک میرے آغوش میں رہی اور بخوشی مجھے اجازت دیدی کہ میں ان آرزوؤں کی تکمیل کروں جن کی محض ابتدا سے وہ ایک روز قبل برہم ہوکر ناراض ہوگئی تھی۔ شاید تنہائی کے لمحات میں اس نے خوب غور کرکے یہ فیصلہ کرلیا ہوگا کہ زندگی کا اصل لطف اسی میں ہے اور اگر یہ کیفیات انسان پر طاری نہ ہوں تو اس کی نگاہ میں کائنات کے ہر ذرہ کو گھن لگ جاتا ہے۔

میں نے محض چھیڑنے کی غرض سے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے اس سے پوچھا "بتاؤ آج "شعریت و موسیقیت" کی فضا کا خون کس نے کیا؟ تم نے یا میں نے؟"

اس نے شرما کر پہلے میری طرف دیکھا۔ کچھ مسکرائی۔ پھر نظریں جھکا کر گھونگھٹ کے اوٹ میں کروٹ بدلتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ گئی "کہ اس کے ذمہ دار دونوں ہیں"

رات کو سونے سے قبل صابرہ نے مجھ سے دوبارہ کہا:۔

"پہلے میرا خیال تھا کہ اس سفر کے واقعات کو ایک افسانہ کی شکل

میں لکھا جائے۔ لیکن اب میں سمجھتی ہوں کہ کئی رومان ایسے پیدا ہو گئے اور آئندہ بھی بہت سے مزید واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا امکان ہے۔ اس لئے کیوں نہ ایک مکمل ناول لکھا جائے۔ جس میں تم ہیرو بنو اور میں ہیروئن، اصل واقعات کے ساتھ افسانوی رنگ پیدا کرنا ضروری ہو گا۔ ہماری بہت سی تصویریں جو یہاں اتاری گئی ہیں اس میں کام آجائیں گی۔ لیکن دیکھو کل اور آج کے واقعات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان سے تمہاری کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے ناول کے دو بڑے باب انہی پر مشتمل ہوں گے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تمام ناول تم اکیلے لکھ دو، اور میں معمولی طور پر دیکھ لوں۔ یا میں تنہا تحریر کر دوں اور تم سرسری نظر ڈال لو۔ بلکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ بیٹھ کر ہم دونوں مشترکہ طور پر لکھا کریں گے۔ اس میں ہمارے ذاتی تاثرات ہوں گے اس لئے ایک دوسرے کا مشورہ ضروری ہے۔ منظر کشی کا کام میرے ذمہ ہو گا۔ میں طرز بیان میں نطق سے لبریز شعریت اور بندش الفاظ میں خاموش موسیقیت پیدا کر دوں گی۔ مزاحیہ رنگ کی چاشنی تمہارے سپرد ہے کیونکہ تم اس میں کمال رکھتے ہو۔ تمہارے بعض چھبتے ہوئے جملے ادب کی معراج ہوتے ہیں۔ فی الحال ہماری کوئی اولاد نہیں اور نہ ہم کو اس کی تمنا ہے مگر فرضی طور پر ہمیں اپنے دو چار بچے بھی ظاہر کرنے ہوں گے تاکہ ان کی شوخیاں اور شرارتیں بیان کی جا سکیں۔ بسا اوقات بچے بھی ایسا رومان پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کی توقع بڑوں سے ناممکن ہے ...."

اس کے بعد بھی خدا جانے وہ کیا کہتی رہی اور کب تک کہتی رہی۔ میں سو چکا تھا۔ چنانچہ جب اس نے گردن پکڑ کے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا، تب

مجھے معلوم ہو سکا کہ مجھ سے کس قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ تاہم اس نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ کہا بلکہ خاموشی کے ساتھ صرف محسوس کرا دیا کہ اس کی گفتگو کے دوران میں مجھے نیند آ گئی تھی۔ میں نے یقین کر لیا کہ آئندہ موقع پر اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ صابرہ کی یہ عادت تھی کہ وہ کسی بات کو بدلہ لئے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ اس کی ایک سزا تو یہی ملی کہ میں صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اگر مجھے نیند میں بیدار کر دیا جائے تو میں دوبارہ نہیں سو سکتا۔ تاہم وہ لمحے بھی بیکار نہیں گذرے۔ میں خوب غور و خوض کرتا رہا کہ واقعی ناول لکھا جائے یا نہیں۔ خود میرا اشتیاق اور صابرہ کی فرمائش اس کے حق میں ترغیب تھی۔ لیکن یہ خیال زبردست طریقہ پر مانع تھا کہ رتن بائی کا کردار اس کے اندر کس شکل میں پیش کیا جائے بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں ان لمحات کو یکسر نظر انداز کر دوں جن میں اس کی یاد نے مجھے لذت درد پہنچا کر بے چین کیا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اگر ناول لکھا گیا تو ان تاثرات قلبی کو ضرور قلمبند کروں گا خواہ صابرہ بدظن ہو کر اپنے اندر رقابت کی آگ ہی کیوں نہ بھڑکا لے۔ ہرچند وہ میری شریک حیات تھی مگر میری روح پر اسکا قبضہ نہیں تھا۔ یہ حق صرف رتن بائی کا تھا ——— میری نادیدہ رتن بائی کا ——— جس کے شاعرانہ فلسفہ میں مجھے زندگی کے راز پنہاں نظر آتے ہیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ میری شریک حیات ہو جاتی تو اس کی ہم جلیسی سے لطف اندوز ہو کر میں سماوی مخلوق کی باہمی گفتگو کو سن لیا کرتا۔

شام کا وقت تھا۔ آفتاب کی سنہری کرنیں پہاڑیوں کے عقب میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی نظر آتیں کبھی روپوش ہو جاتیں۔ دن کا آخری جلوہ

بلند درختوں کی ہوا سے تھرتھراتی ہوئی پھننگوں پر ہنوز رقص کر رہا تھا۔ کہیں کہیں جھیل کے پرسکون پانی پر شعاعیں منعکس ہوکر چکاچوند پیدا کر رہی تھیں صابرہ کی طبیعت کسی قدر ناساز تھی۔ اس لئے میں کشتی سے نکل کر جھیل کے کنارے کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ چیخوف کے افسانے اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیائے ادب میں بے مثل ہوتے ہیں۔ واقعات روزمرہ کے نفسیاتی پہلو دل کو اس عمدگی سے بے نقاب کرتا ہے کہ انداز بیان داد سے مستغنی ہوجاتا ہے۔ میں مطالعہ میں اس قدر محو تھا کہ قرب وجوار کی رنگینیاں میری توجہ کو اپنی طرف مائل نہ کر سکیں۔ میں ایک استغراق کے عالم میں دور نکل گیا اور یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کس قدر فاصلہ طے کر لیا ہے۔ کہ اچانک مجھے ایک ہلکی چیخ سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ نظر کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ البتہ بائیں جانب پتوں کی اوٹ میں کوئی حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے ڈالیوں کو ہٹا کر قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خوب صورت نوجوان خاتون گلاب کے پودے کے پاس گھٹنے ٹکائے کھڑی تھی وہ اپنی انگلی کو ——— جس میں غالباً کانٹا چبھ گیا تھا ——— دبا دبا کر آرام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دامن میں چنے ہوئے تمام پھول گھاس پر بکھر گئے تھے۔ میں نے بطور ہمدردی حادثہ کی نوعیت دریافت کی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ صرف انگلی کو میری طرف بڑھا کر نظریں نیچی کر لیں۔ کوئی بڑا زخم نہیں تھا۔ معمولی خراش تھی۔

میرا معمول ہے کہ دوران سفر میں ہمیشہ ایک جیبی ادویاتی بکس اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ لہذا اس کو کھول کر تھوڑا ٹنچر اس کی انگلی پر لگا دیا اور کس کر پٹی باندھ دی۔

کچھ دیر بعد اس نے آنچل میں پھول اٹھائے اور چلنے کے لئے تیار ہوگئی میں نے بطور تعارف اس سے چند سوال کئے اور اس کے استفسارات کا جواب بھی دیدیا۔ کچھ زیادہ فصل نہیں تھا۔ اس کی رہائش کشتی نمبر ۵ میں تھی اور میرا قیام نمبر ۲۲ میں۔ انداز گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی پرورش لکھنؤ کی طرف ہوئی ہے۔ لب و لہجہ میں ایک دلفریب کھٹکا اور نہایت اچھے دانہ اردو ——— بظاہر شریف النفس اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتی تھی۔ چونکہ تاریکی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں رخصت ہو کر اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف چلے گئے۔

یہ واقعہ کچھ اتنا اہم نہیں تھا کہ مجھے یاد رہتا۔ نیز صابرہ کی ناسازیٔ طبع کے باعث اور بھی جلدی ذہن سے اتر گیا۔ وہ بہت علیل نہیں تھی۔ مگر سر کا درد اسے کافی پریشان کر دیتا ہے۔ اس لئے ہمارے درمیان زیادہ گفتگو بھی نہیں ہوئی اور وہ کھانا کھائے بغیر جلدی سے سوگئی۔ میں محض وقت گذارنے کی خاطر کچھ دیر کے لئے کھڑے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ آج بھی چاندنی رات تھی اس لئے تین چار روز قبل کے وہ واقعات یاد آ گئے۔ جن کی ناشائستگی پر صابرہ مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ اگر اس موقع پر رتن بائی ہوتی تو شاید وہ صابرہ سے بھی زیادہ برہم ہو جاتی۔ کیونکہ اس کے خطوط سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ذوق تجسس ہر چیز میں شعریت، موسیقیت اور رومانیت کا متمنی سا رہتا ہے۔

اس کے تیسرے روز کا ذکر ہے۔ علی الصباح میں لباس تبدیل کر کے باہر آیا تو صابرہ بت بنی کھڑی تھی اس کے قریب ہی کرسی پر پھولوں کی ٹوکری رکھی تھی۔ درمیان میں ایک خوبصورت گلدستہ تھا اس کے چاروں طرف

مختلف رنگ کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ میں متعجب ہوا کیونکہ صابرہ خود قریب کی کیاریوں سے پھول توڑ لاتی تھی۔ اس سے قبل کبھی بازار سے نہیں خریدے گئے تھے اور نہ اس قدر نفاست کے ساتھ ٹوکری میں سجا کر رکھے گئے تھے۔ میں نے دریافت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جس کے جواب میں وہ بولی:۔

"تمھارے لئے تحفہ آیا ہے"

"تحفہ! اور میرے لئے؟" میں نے تعجب سے پوچھا "کس نے بھیجا ہے؟ اس سرزمین پر مجھ سے کوئی واقف نہیں"

"مجھے مبتلائے فریب مت کرو۔ اگر کسی سے شناسائی نہیں تو بتاؤ کہ پرسوں شام تمہاری نوازشوں سے کون فیضیاب ہوا تھا؟"

اف! مجھ پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ اپنی حماقت کا افسوس ہوا کہ آخر وہ معمولی واقعہ پہلے ہی سے صابرہ کے گوش گذار کیوں نہ کر دیا۔ میرے حواس مختل ہو کر رہ گئے۔ قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔

"زبان سے کچھ نہ کہا جائے تب بھی آنکھوں کی وحشت اور چہرے کے اڑے ہوئے رنگ سے کیفیت قلب معلوم ہو جاتی ہے۔ تم نہیں بولتے نہ بولو لیکن یہ پیام ضرور سن لو" اور یہ کہہ کر اس نے کاغذ کا چھوٹا سا پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لے کر پڑھا۔ لکھا تھا:۔

"پرسوں شام آپ کی نوازشات کا شکریہ ادا کرنا یاد نہیں رہا۔ معاف کیجئے۔ آج ایک حقیر تحفہ اظہار تشکر کے طور پر ارسال خدمت ہے، قبول فرمائیے۔

پھول کچھ میں نے چنے ہیں انکے دامن کیلئے
میری قسمت سے الہٰی پائیں یہ رنگ قبول

تمام حقیقت واضح تھی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اب صابرہ کو اس تاریکی میں رکھوں۔ لہٰذا بے کم و کاست سب واقعہ بیان کر دیا اور ساتھ ہی یقین دلایا کہ میرے دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ میری باتوں سے اس کے چہرے کے ملال میں کمی ہو گئی۔ مگر تیوری کے بل باقی رہے اس کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔

چند ہی منٹ گذرے تھے کہ ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا "معاف کیجیے! میں غلطی سے پھولوں کی ٹوکری آپ کو دے گیا۔ میرے مالک نے تو برابر کی کشتی میں بھیجے تھے۔"

میں نے دوبارہ پرچہ پڑھا۔ کسی جملہ کی ترکیب سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ تخاطب مرد کی طرف سے عورت کے نام ہے یا عورت کی طرف سے مرد کے نام۔ صرف شعر کے نفس مضمون سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ پھول عورت کے دامن کے لئے موزوں ہوتے ہیں اور اس لئے تحفہ مرد کی طرف سے ہے اف! کتنی زبردست غلط فہمی تھی۔ میں پشیمان تھا کہ محض مغالطہ کی بنا پر پرسوں شام کے راز کو کیوں منکشف کر دیا۔ مجھے سخت غصہ آ رہا تھا میں نے گلدستہ کو نوچ کر پانی میں پھینک دیا۔ پرچہ کو پھاڑ ڈالا اور اس لڑکے کو خوب زدوکوب کر کے دل کی بھڑاس نکالی اور اگر خود صابرہ مانع نہ ہوتی تو میں جا کر اس کے مالک کو بھی دھمکاتا۔

صابرہ کا دل صاف ہو گیا تھا مگر پھر بھی وہ میری طرف سے بدظن ہو گئی اور ان ہی شکوک کی بنا پر بہت جلد وطن واپس چلنے کی ٹھہرا دی علاوہ ازیں رات کو کئی بار اس نے دبے پاؤں اپنے پلنگ سے اٹھ کر مجھے دیکھا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں موجود ہوں یا نہیں، مجھے بھی نیند نہیں

آئی تھی اس لئے اس کی نقل و حرکت کو محسوس کرتا رہا۔

ارضِ کشمیر کی ترنم ریز موسیقی اور شعر و رومان سے لبریز فضا کو خیر باد کہہ کے ہم واپس آ گئے تو میری ڈاک پر "سنسر" ہونے لگا۔ جب تک میرے خطوط کو صابرہ نہ پڑھ لیتی وہ مجھ کو نہ دئے جاتے۔ پہلے تو میں نے خیال نہ کیا۔ بعد میں بہت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ آخر میں اس کے تابع ہو کر زندگی کیوں بسر کروں؟ لہٰذا ایک دن میں نے سختی کے ساتھ تنبیہہ کر دی کہ وہ میرے خطوط کا جائزہ نہ لیا کرے۔ چونکہ اب تک کسی خط میں کوئی بات قابلِ گرفت نہ نکلی تھی اس لئے صابرہ خاموش ہو گئی اور اپنے رویہ کو تبدیل کر لیا۔

روزمرہ کے ان تنازعات کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آپس میں کشیدگیاں شروع ہو گئیں۔ بظاہر وہ مجھ سے خوش تھی اور میں اس سے مسرور۔ لیکن درحقیقت ہم دونوں ایک دوسرے سے اکتا گئے تھے۔ اکثر میں اور صابرہ یکجا بیٹھ کر ان مسائل پر غور بھی کرتے لیکن بے سود۔ وہ مجھ کو قصوروار ٹھہراتی اور میں اس کو ذمہ دار۔ تاہم ہماری اس اَن بَن کا چرچا ہمیں تک محدود رہتا۔ عزیز اقارب میں سے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ کیونکہ ہماری رنجش دیرپا نہ ہوتی تھی۔ صبح کو لڑائی ہوئی تو شام تک صلح ہو گئی اور شام کو جھگڑا ہوا تو صبح مل بیٹھے البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس نے اپنے میکے کے قیام میں اضافہ کر دیا۔ لوکل سسرال سے بڑا نقص یہی ہوتا ہے۔

کبھی کبھی جب ہم دونوں میں زیادہ صلح ہوتی تو صابرہ مجھ سے فرمائش کرتی کہ سفرِ کشمیر کے حالات کو رومانیت کے رنگ میں تحریر کرنا شروع کر دیا جائے لیکن میں اس کی شرکت نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں تنہا اس

روئداد کو قلمبند کروں۔ اس لئے ہمیشہ ٹال دیتا۔ وہ بہت بگڑتی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اس کی برہمی کو عارضی طور پر دور کر دیتا۔ چنانچہ ایک دفعہ اسی موضوع پر جھگڑ کر وہ میکے چلی گئی اور مجھ سے کہہ گئی کہ ایک ماہ سے قبل واپس نہیں آؤں گی۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ اعتراض کرتا۔ اس میں میرا کیا نقصان تھا بلکہ الٹا فائدہ ہوا یعنی مکان پر یار دوستوں کی نشست و برخاست زیادہ رہنے لگی۔ فرصت کا وقت لطف و نشاط کے ساتھ گذرنے لگا اور مضمون نگاری کے لئے بھی خوب موقع مل گیا۔

انہی دنوں میں نے سوچا کہ یہ فرصت کا وقت غنیمت ہے۔ صابرہ کی غیر موجودگی میں کشمیر کا افسانہ شروع کر دیا جائے اس کی واپسی تک ختم ہو جائیگا۔ دل میں ارادہ کا پیدا ہونا تھا کہ اس نے عملی صورت اختیار کر لی۔ سفر کی غرض و غائت، راستہ کی دلچسپیاں، سری نگر کا قیام، وہاں کی دلفریب فضا قدرتی مناظر، صابرہ کے ساتھ شاعرانہ مکالمے، چاندنی رات کی تقویٰ شکن کیفیات، میری دست درازیاں اور اس کا بگڑ جانا، ناز و ادا، عشوہ و اندازہ، صابرہ کی موسیقی پر تقریظی تبصرہ، پھول توڑنے والی خاتون سے ملاقات تحفہ گل کی غلط فہمی اور ان سب سے زیادہ رتن بالی کی روح فرسا یاد ـــــــ غرض یہ کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ میں نے اپنی طرز تحریر کے تمام رنگ ان نقوش میں بھر دیئے۔ منظر کشی کے وقت اچھوتے استعاروں اور جدید تشبیہوں کے ذریعہ نثر میں شاعری کا لطف پیدا کر دیا اہم مسائل کا تجزیہ کرتے وقت فلسفیانہ متانت و سنجیدگی خوش مذاقی کی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے نہایت مزاحیہ اور ظرافت سے

بربیزتر پا دینے والے جملے، باہمی مکالموں اور گفت وشنید میں ڈرامیائی کش مکش، ضرورت وقت کے لحاظ سے بلند پایہ اشعار کا استعمال، نیز جو تصاویر نفس مضمون سے متعلق ہوسکتی تھیں ان کے بلاک بنوالئے۔

سب کام تیار تھا، صرف دیباچہ کی ضرورت تھی۔ مناسب سمجھا کہ صرف یہ خدمت صابرہ کے سپرد کی جائے۔ انتساب کی بابت بھی سوچ لیا تھا کہ اس خاتون کے نام معنون کروں جس کے ساتھ محض خط وکتابت کے ذریعہ غائبانہ تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ اور جو نشو ونما پاکر محبت کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر ملاقات نہ ہوسکی۔ جس کو بھول چکا مگر پھر بھی یاد باقی ہے جس کو نظر نے نہیں دیکھا مگر صورت آشنا ہوں۔ جس کی آواز نہیں سنی مگر لب ولہجہ کی نزاکت کا علم ہے۔ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی بندش اس طرح قائم کی تھی کہ صابرہ اور دوسرے قارئین کو بھی معلوم نہ ہوسکے کہ اس میں حقیقت جلوہ گر ہے۔ بلکہ ہر شخص اس تہدیہ کو بھی ایک افسانوی رنگ میں لیتا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے صابرہ کو بلانے کے لئے پیغام بھیجا۔ وہ شاید اسی کی منتظر تھی۔ فوراً چلی آئی۔ عارضی جدائی کا صدمہ بہت جلد غبار کدورت کو صاف کر دیتا ہے۔ نہایت گرم جوشی کے ساتھ ہم آپس میں بغل گیر ہوئے اور لذت التئام حاصل کرتے ہوئے تجدید محبت کر لی۔

رات کے وقت تمام مصروفیتوں سے سبک دوشی حاصل کرنے کے بعد میں نے اس طویل افسانہ کا مسودہ اس کے سامنے پیش کیا۔ وہ پہلے تو بالکل نہ سمجھی اور نہ سمجھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔ کہ میں وہ افسانہ لکھ لوں گا جب کہ کئی بار اس کی فرمائشوں کو رد کر چکا تھا۔ میں

نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا کہ وہ ایک قصیدہ ہے خود اس کی شان میں۔ ایک سراپا ہے اس کے پیکر ناز کا، ایک حقیقت ہے افسانہ کے رنگ میں اور ایک رومان ہے اصلیت کے انکشاف کا۔

اس نے نہایت بے تابی کے ساتھ مسودہ کے اوراق الٹے۔ کہیں کہیں سے چند سطور کا مطالعہ کیا، میں نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا اس کی تیوری پر بل آ رہے تھے۔ آنکھوں سے غصہ ٹپکنے لگا۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ تمام جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ سینہ کا نشیب و فراز بتا رہا تھا کہ اس کے تنفس کا ہیجان قلب کی حرکت کو بند کر دینے کی حد تک تجاوز کر گیا تھا اف! اس کے جذبات کی برانگیختگی ناقابل بیان تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے زندگی میں پہلی مرتبہ میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔

"شمیم! اس افسانہ کو لکھنے کی تجویز میری تھی۔ تم اس کو دائرۂ عمل میں نے آئے اس طرح کہ اس میں حصہ لینے کا مجھے حق بھی نہ دیا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ یہ مشروط طور پر قلم بند کیا جائے گا۔ کیا میں تمہاری رفیق حیات نہیں ہوں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ تم نے مجھے نظر انداز کر دیا؟ میری شخصیت کی مطلق پرواہ نہ کی میرے سینے میں بھی ایک دل ہے ایک روح رکھتی ہوں۔ تم چاہتے ہو کہ میں صرف دیباچہ لکھ دوں تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے میری تمناؤں کو پامال کر دیا۔ اور میں تمہارے اسلوب بیان کی تعریف کروں۔ میری آرزو تھی کہ اس کے سرورق پر تمہارے ساتھ میرا بھی نام ہو ہمارے مضامین اب تک مشترکہ طور پر لکھے گئے تھے۔ اب افتراق کیوں ہو میں اس رمز کو سمجھتی ہوں۔ میں کچھ عرصہ سے تمہارا مطالعہ کر رہی تھی۔ مجھے

اصل حقیقت کی اطلاع مل گئی ہے کہ شادی سے قبل تمہاری نظرِ انتخاب نے کسی دوسری خاتون کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون تھی اور کیا تھی۔ تمہارے خاندان کا ایک رکن تھی یا غیروں میں اس کا شمار تھا وہ اب کہاں ہے؟ مجھے اس کا بھی علم نہیں۔ میرا قیاس ہے کہ ارضِ کشمیر میں تحفہ بھیجنے والی خاتون ہی تمہاری منظورِ نظر تھی۔ تم نے اپنی چالاکی سے مجھے فریب دیا۔ ایسی ترکیب کی کہ وہ گلدستہ واپس منگا یا گیا اور میرے شکوک عارضی طور پر رفع ہو گئے۔ لیکن اب تمہارے پلٹے ہوئے تیور، پھری ہوئی نظریں، تمہاری بے رخی، بے التفاتی بتا رہی ہے کہ تم کسی نئی دنیا کی سیر کے آرزومند ہو۔ شادی کے بعد دو سال تک میرے جسم سے تم اپنی خواہشات کی تسکین کرتے رہے۔ اب تمہارے جذبات تھک چکے ہیں۔ تمہارا جوش وولولہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تم ایسی ہستی کے متمنی ہو جو دوبارہ ان میں حرارت پیدا کر دے۔ بیشک میرے اندر کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ کوئی کشش باقی نہیں۔ مگر ان رعنائیوں کو پامال کرنے والے بھی تو تم ہی ہو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ اپنے عیش و نشاط کے لئے دوسری شریکِ حیات حاصل کر سکتے ہو خدا کا شکر ہے میرے بھائی زندہ ہیں۔ میرے والدین حیات ہیں۔ میں اپنے دیرینہ عزیزوں میں زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ تم خوش رہو۔ تمہارے لبوں کے تبسم پر اپنے آنسوؤں سے جلا دیتی رہوں گی۔

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور میں بت بنا خاموش کھڑا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا وہ اپنے فعل سے معذور تھا۔ قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ بولنا چاہا مگر زبان نے جنبش نہ کی۔ سوچا

رہا، سوچتا رہا۔ کہ آخر یہ کیا ہو گیا۔ مگر عقل کام کرنے سے عاجز تھی۔
رات کے ناقابل برداشت لمحے میں نے آنکھوں میں بسر کئے اور شاید وہ بھی تمام شب روئی۔ اس کی سسکیاں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ علی الصبح وہ اٹھی اور مجھ سے گفتگو کئے بغیر ملازم سے تانگہ منگا کر اپنے میکے چلی گئی۔

صابرہ کے چلے جانے کے بعد میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اپنے قصور کا اعتراف کر کے، اپنی غلطی کو تسلیم کر کے اسے منا لاؤں کیونکہ دو سال سے زیادہ عرصہ میں اس کے جسم و روح کا مالک رہا تھا۔ عورت تن کا کپڑا نہیں ہوتی جس کو استعمال کر لینے کے بعد جسم سے علیحدہ کر کے پھینک دیا جائے اس کی ہستی قابل احترام ہوتی ہے۔ وہ شریک حیات کہلاتی ہے اسے "نصف بہتر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن ضمیر کی اس آواز کو خودداری کا احساس کچل ڈالتا۔ عورت کے مقابلہ پر ہار مان لینا ایک قسم کی سبکی تھی جس کو دل نے گوارا نہ کیا۔ نیز یہ بھی سوچتا تھا کہ باہمی کشیدگیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ اب مستقل مصالحت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اتحاد کی کوشش بے سود سمجھی اور صرف اس امید پر خاموشی اختیار کر لی کہ شاید طویل جدائی سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو جائے۔
یہ اصول ہے کہ جب انسان مسرت و انبساط کی خوشگوار فضا میں سانس لیتا ہے تو اسے شاندار مستقبل خواب نظر آتے ہیں۔ لیکن بر خلاف اسکے جب اس کی روح مبتلائے آلام ہوتی ہے، جب مصیبتوں کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑتا ہے تو اسے عہد گذشتہ کے واقعات اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے گنبد میں صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ماضی کی ہر بات

اس کے لئے ایک افسانہ پارینہ بن جاتی ہے۔ وہ انھیں یاد کرکے آنسو بہاتا ہے۔ حادثات زندگی بھی اسے نعائمِ دنیوی معلوم ہوتے ہیں۔

اس دفعہ صابرہ کے چلے جانے کے بعد میری آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی۔ نہ سیر و تفریح کو جی چاہتا نہ دوست احباب کی صحبتوں میں مسرت حاصل ہوتی۔ ہر وقت تفکرات کے عالم میں غرق رہتا۔ سوچتا تھا کہ زمانہ کا رنگ کیا تھا اور اب کیا ہو گیا۔

ایک بار پھر رتن بائی کی یاد مجھے ستانے لگی۔ اپنی اس کوتاہ اندیشی پر نادم تھا کہ میں نے اس کے لطیف خطوط کیوں پھاڑ کر جلا دیئے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو میرے زخم دل کی مسیحائی کرتے۔ انھیں بار بار پڑھتا اور عہد شباب کی ان رنگینیوں سے حظ اٹھاتا جو کبھی میرا بھی حصہ رہی تھیں۔ لیکن نہ وہ خطوط باقی تھے اور نہ رتن بائی کا کچھ پتہ معلوم تھا۔ وہ کس شہر کی رہنے والی تھی۔ کس خاندان کی رکن تھی میں لاعلم محض تھا۔ اس سے دوبارہ ملنے کی کوئی امید بھی نہیں تھی کیونکہ رسالہ میکش بند ہو چکا تھا جس کی معرفت ہماری خط و کتابت ہوتی تھی ایڈیٹر کے متعلق بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ رسالہ کی اشاعت ترک کرکے کہاں گئے ؟ بقیدِ حیات ہیں یا اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ کوئی دوسری ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کس طرح اس معبود خیال کی بارگاہ میں پہنچوں بس تصورات کی دنیا میں ہر وقت اس کی یاد کو قائم رکھنا مقصد حیات بن گیا تھا

گذارے تھے خوشی کے چند لمحے	انھیں کی یاد میری زندگی ہے

~~~~~~~~~~

ایک دن طبیعت بہت گھبرائی تو محض وقت گذارنے کی غرض سے چوک چلا گیا۔ اخبار والے کی دکان پر بے شمار رسالے رکھے تھے۔ ان میں سے چند
~~~~~~~~~~

اٹھاکر میں نے ورق گردانی شروع کر دی۔ اور کارلائل کے اس زرین قول کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ "انسان کے احساسات اس قدر بلند و وسیع ہونے چاہئیں کہ وہ دوسروں کے لکھے ہوئے فرضی افسانوں میں خود اپنی زندگی کا مطالعہ کرسکیں" میں نے کوشش کی کہ کوئی افسانہ یا مضمون ایسا نکل آئے جو میرے حسب حال ہو تو ایک رسالہ میں بھی خرید لوں ع

تجسس ہو تو مل جاتا ہے سب کچھ دار امکاں میں

اچانک میری نظر رسالہ رنگین کے ایک صفحہ پر پڑی۔ عرصہ دراز کے بعد رتن بائی کا مضمون شائع ہوا تھا اور یقیناً وہ صرف میرے لئے لکھا گیا تھا ظفر کی مشہور و معروف غزل کا یہ مصرعہ اس کا عنوان تھا۔

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بجلی کی ایک لہر تمام بدن میں دوڑ گئی۔ وفور شوق میں آنسو مچل جانے کے قریب تھے کہ میں نے ضبط سے کام لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاس کھڑے ہونیوالے لوگ میرے جذبات قلب کو سمجھ جائیں۔ مسلک عشق میں روا نہیں کہ اپنے درد دل کو سوائے درماں کے کسی دوسرے کے روبرو ظاہر کیا جائے۔ میں نے رنگین خرید لیا اور فوراً گھر کی راہ لی۔ تاکہ تنہائی میں اس کا مطالعہ کر دوں:-

رتن بائی کا مضمون ایک خط کی شکل میں تھا —— نہایت دردناک اور سوز سے لبریز ——

میرے لاپتہ معبود! کیا تو حقیقی معنوں میں معبود ہے؟ جو نظر نہیں آتا۔ تیرا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ شاید تو نے مجھے فراموش کر دیا لیکن میرے دل میں ابھی تک تیری یاد باقی ہے۔ تیرے نقوش محبت میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کا وجود میرے لئے حیات افزا

ہے اگر اس دنیا میں تو کہیں ہے تو مجھ سے کیوں نہیں ملتا ؟ —
کیوں میرے معبود ؟

آہ! وہ بھی کیا دن تھے جب عہد شباب کی رعنائی خیال مجھ پر طاری تھی - میں اپنے اوہام شریعت میں مبتلا تھی سمجھتی تھی کہ کائنات کا ہر ذرہ جو آج رنگین نظر آرہا ہے ہمیشہ ایسا ہی رنگین رہیگا۔
یہ میری کج فہمی تھی جس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں ؎

ہر چیز پہ بہار تھی ہر شئے میں حسن تھا　　دنیا حسین تھی مرے عہد شباب میں

تو نے مجھ سے التجا کی کہ دونوں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو جائیں میں نے تیری تجویز کو ٹھکرا دیا اور شاید اسی پاداش میں آج میری آرزوئیں پامال ہو رہی ہیں۔ اس وقت میں اپنے غلط پندار میں ازدواج محبت کی قائل نہیں تھی۔ سمجھتی تھی کہ شادی قاطع محبت ہے - اس لئے میں نے منظور نہیں کیا یہ رمز مجھے پہلے سے واضح تھی کہ شباب ہر لحاظ سے پامال ہو جاتا ہے ع

جوانی جذب ہو جاتی ہے آغوش جوانی میں

لیکن عمیق النظری سے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا تھا اب اس حقیقت کو سمجھی ہوں کہ غیر کے آغوش میں جذب ہو کر بھی جوانی بالکل فنا ہو جاتی ہے مگر محبوب کے آغوش میں جذب ہو کر بھی روح قلب پر مرتسم رہتی ہے! اور اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ کبھی پھر بھی تاثرات کے ماتحت ابھر آئے اگر محبت ایک لاعلاج مرض ہے تو یقیناً ایک مرتبہ ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کو دوبارہ عود کرنا چاہیئے۔
میرا فلسفہ تھا کہ " جس شخص میں عمدہ شوہر بننے کی صلاحیت موجود ہو کبھی صدق دل سے محبت نہیں کر سکتا اور جس کے قلب میں قدرت

نے حقیقی محبت کا کرنے کا مادہ ودیعت کیا ہے شوہر بننے کی صورت میں ناکامیاب زندگی بسر کرنے کا۔ اس قول کا ابتدائی حصہ میری عملی زندگی میں ثابت ہو گیا۔ مگر دعویٰ ہے کہ باقی نظریہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ میرے شوہر میں سب خوبیاں موجود ہیں مگر وہ میرے جذبات کی قدر نہیں کرتا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے کام لیتا ہے اس کو مجھ سے حقیقی محبت نہیں اور وہ اس لئے کہ اس کی منظورِ نظر کوئی دوسری ہستی ہے جس سے میں واقف نہیں ؎

میرے معبود! اب میں تجھ سے صرف اس قدر چاہتی ہوں کہ میرے لئے کوئی ذریعہ تسکین پیدا کر دے تو ایک بار پھر میرے خاموش سازِ دل کو اپنے مضرابِ خیال سے چھیڑ دے تو خود شعر نہ کہہ۔ لیکن میرے لئے موضوعِ شعر بن جا۔ تو اپنے فلک پیما تخیلات سے مجھے اس نگری میں پہنچا دے جس کی فضا میں سانس لیکر مصلوب الجذبات لوگوں کے قلب میں بھی احساسِ شباب پیدا ہو جاتا ہے ؎

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

بتا! میری روح کے مالک! کیا تجھ سے ملنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی۔ کیا میں دوبارہ اسی رومانیت کی فضا میں زندگی بسر کر سکتی ہوں آج میری شاعرانہ ذہنیت نغمہ بہار الاپنے کے بجائے خزاں کے ماتم میں مرثیہ خواں ہے۔ میری زمزمہ ریزیاں سوزِ قلب میں ڈوبی

ہوئی ہیں۔ میرے تھکتے آنسوؤں میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں میری سہاگ کی راتیں سوگواری میں گذرتی ہیں تو ان میں تغیر پیدا کردے۔ میں اپنی زندگی میں زبردست انقلاب کی متمنی ہوں ——— لیکن بغیر کسی محرک کے یہ ناممکن ہے ——— بتا! میرے مالک تو میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔ اگر تو مجھ سے مل سکا تو میں ایک ایسے راز کا انکشاف بھی کر دوں گی جو آج تک تجھ کو معلوم نہیں۔

تیری

ایک وارفتہ تخیل داسی

خود میرے آلام حیات ہی کیا کم تھے کہ رتن بائی کی داستان غم نے اور بھی سوز قلب میں اضافہ کر دیا۔ میرا جی چاہا کہ اس کو اپنے ساتھ لے کر اس سرزمین سے دور ایک ایسی مقدس نگری میں پہنچ جاؤں جہاں فرشتوں کے معصوم تبسم کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ چونکہ سب سے پہلے اس سے ملاقات کرنی ضروری تھی اس لئے تمام کام چھوڑ کر مدیر رحیقؔ کی معرفت حسب ذیل سطور لکھ کر روانہ کر دیں

پیاری رتن!

رحیقؔ نظر سے گذرا تھا تمہاری داستان غم سے جو لذت درد میں نے حاصل کی وہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ تم خود بتاؤ کہ میں تم سے کہاں مل سکتا ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تمہارا وطن کہاں ہے تمہارا قیام دنیا کے کسی حصہ میں کیوں نہ ہو میں بسر و چشم پہنچ جاؤں گا میں بھی تم سے ملنے کا متمنی ہوں، چاہتا ہوں کہ ایک بار حقیقی طور

پر تمہاری شعریت اور موسیقیت سے لطف اندوز ہو سکوں۔
شاید یہ سن کر تم کو تعجب ہوگا کہ میری ازدواجی زندگی بھی نہایت کوفت کے ساتھ گذر رہی ہے۔ درحقیقت میری بیوی تمہارے شوہر کے لئے مناسب تھی اور تم میرے لئے موزوں۔ مگر قسّام ازل کو یہ منظور نہ تھا۔ قدرت نے ایسے واقعات پیدا کئے۔ کہ معاملہ برعکس رہا۔ میں تم سے ملنے کے بعد تمہارے شوہر سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا۔ خدا کرے وہ میری مساعی سے راہ راست پر آجائیں۔ عورتوں کی طرح مرد ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہوتے وہ بہت جلد رام ہو جاتے ہیں۔ اگر میں تمہارے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں کامیاب رہا تو سمجھوں گا کہ میں نے حق انسانیت ادا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے قوی امید ہے کہ تم بھی میری شریکِ حیات کو اپنی بہن تصور کرتے ہوئے سمجھاؤ گی —— اچھا اب وقت تھوڑا ہے۔ لہٰذا مفصل گفتگو کو اسی وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں جب کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر مسائل زندگی پر غور کریں گے بتاؤ میں تم سے کہاں ملوں ؟

تمہارا نادیدہ بھائی
انجم جمالی

خط روانہ کر کے یہ سوچنا شروع کیا کہ آئندہ سے لائحہ عمل کیا رہے۔ صابرہ سے واقعی علیحدگی گوارا نہیں تھی اور یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ رتن بائی اپنے موجودہ خاوند کو چھوڑ کر میری شریکِ حیات نہیں بن سکتی کیونکہ مذہبی

رسوم کی قیود مانع آزادی تھیں۔ صرف یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ اسے اپنی تصور کرتے ہوئے ہر طرح کی امداد پہنچاؤں اور اگر ایثار کی ضرورت ہو تو روح کی قربانی سے بھی دریغ نہ کروں۔

دوسرے روز میں کھانا کھا کر لیٹا تھا کہ مکان کے باہر تانگہ کے پہیوں کی آواز سنائی دی۔ اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر صابرہ اندر داخل ہوئی۔ مگر اس نے میری طرف بالکل التفات نہ کیا اور نہ حسب عادت سلام ہی کیا۔ بلکہ کمرے کے اندر جا کر لیٹ گئی۔ میں حیران تھا کہ آخر اس کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ خود اس لئے مخاطب نہ ہوا کہ جب وہ بے رخی برت رہی ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ رجوع کروں اگر وہ ناراض ہے تو میری برہمی بھی کچھ کم نہیں۔ میں نے سوچا کہ خاموشی اختیار کر لی جائے اور دیکھنا... چاہیئے کہ کب تک اس کا غصہ فرو نہیں ہوتا۔ اب دل میں کوئی تمنا باقی نہیں تھی جو خوشامد کر کے اسے منا لینے کی کوشش کرتا۔ میرے جذبات کو سخت صدمہ پہنچ چکا تھا اس لئے اس کا آنا یا نہ آنا برابر تھا۔ بلکہ درحقیقت اس کے واپس چلے آنے سے روح کو کسی قدر اضمحلال نصیب ہوا۔ کیونکہ گذشتہ واقعات کی یاد دل میں تازہ ہو گئی اس کا بار بار لڑنا جھگڑنا۔ معمولی باتوں پر ناراض ہو جانا' اس کی خشمگیں آنکھیں' تیوری کے بل' بے رخی بے التفاتی اور کچھ غرور حسن بھی۔ یہ باتیں تھیں جن کا خیال کرتے ہی میرے دل میں نفرت کا مادہ پیدا ہو گیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ ہرگز گفتگو نہیں کروں گا۔ تاوقتیکہ وہ خود اپنے مذموم طرز عمل کی بابت اظہار ندامت کرتے ہوئے آئندہ کے لئے تائب نہ ہو۔

رات زیادہ ہوگئی تو میں دوسرے بستر پہ جاکر دراز ہوگیا۔ مگر نیند نہ آئی خاموش لیٹا کروٹیں بدلتا رہا یہاں تک کہ نصف شب ہوگئی۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا کہ صابرہ کے کمرے سے کچھ آہٹ سنائی دی۔ معاً خیال آیا کہ وہ بھی بیدار ہے۔ لیکن کیوں ــــ ؟ میری مشکوک طبیعت نہ مانی ارادہ کیا کہ اس کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ وہ بستر پر لیٹی ہے یا کسی اور کام میں مشغول ہے۔ میں بہت احتیاط کے ساتھ بستر سے اٹھا اور اس دروازے کے قریب جو میرے اور صابرہ کے کمروں کے درمیان تھا جاکر کھڑا ہوگیا جھری میں سے جھانکا وہ بیدار ہی نہیں تھی بلکہ اپنی سنگار میز کے سامنے بیٹھی کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ اپنے زیورات لیے آئی ہے۔ جن کو میکے جاتے وقت یہیں چھوڑ گئی تھی لیکن اس کو زیورات کی کیا ضرورت ــــــــــ میری غیر موجودگی میں اس کا تزئین جمال کس کے لیے ہوگا۔

ابھی میں انہی خیال آرائیوں میں تھا کہ وہ کرسی سے اٹھی اور میں نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہیں۔ خط کی شکل میں۔ وہ مختلف رنگ کے لفافے تھے جن کو الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی وہ پلنگ کی طرف بڑھی اور تمام پلندہ تکیے کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی میرے قلب میں تشکیک وارتیاب کا مادہ جوش میں آگیا۔ آتشِ رشک بھڑک اٹھی وہ کس کے خطوط تھے جہاں تک میرے علم کا تعلق تھا ازدواجی زندگی میں اس کے نام ایک کارڈ بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس راز کو معلوم کئے بغیر چین نہ لوں گا۔ چنانچہ شکار کے تھیلے میں سے ایک لمبا تیز چاقو نکال کر جیب میں چھپا لیا اور جھری کے قریب آنکھ لگا کر منتظر رہا کہ وہ کب

آسودۂ خواب ہو اور میں اس کے کمرے میں داخل ہو کر ان خطوط پر قبضہ کروں
میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو اسی رات اس کی
زندگی کا خاتمہ کر دوں گا اور رتن بائی سے ایک بار ملنے کے بعد اپنا بھی۔
بہت رات گذر جانے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ بیدار
نہیں ہے تو کھڑکی کے راستے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا اور چراغ کی
مدھم روشنی میں ایک سایہ کی طرح حرکت کرتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا وہ بے
خبر سو رہی تھی۔ چہرے پر اطمینان بلکہ ایک حد تک شگفتگی تھی۔ یا میرے تعصبات
دماغی نے اس کو اس رنگ میں دکھایا۔ میرے ہاتھ نے دستِ غیب کی طرح
بہت آہستہ جنبش کی۔ میں نے کمال احتیاط سے اس کے تکیہ کو سرکانا چاہا۔ وہ
ایک دم چونک پڑی۔ ابھی اس کی نیند کچی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس
نے کرخت لہجہ میں پوچھا:۔

"تم! ——— تم میرے کمرے میں رات کے وقت بلا اجازت کیوں
آئے؟"

"مجھے اس کا حق ہے"۔ میں نے ترش روئی سے جواب دیا۔

"حق حاصل ہے۔ لیکن تکیہ کیوں اٹھا رہے تھے؟" اس نے طنز
کے طور پر کہا۔

"وہ خطوط جو تم نے اس کے نیچے چھپائے ہیں فوراً مجھے دیدو"۔ میں نے
تحکمانہ لہجہ میں کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ہرگز نہیں۔ تم ان پر قبضہ نہیں کر سکتے"۔

"خاموش رہو ورنہ اس کا نتیجہ برا رہے گا۔ میں عرصہ دراز سے تمہارے
کردار کا مطالعہ کر رہا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ آج کامیاب ہو گیا"۔

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کو ایک طرف دھکا دینا چاہا مگر وہ سینہ سپر ہوکر میرے مقابل آگئی۔

"مجھے مار ڈالو۔ لیکن میری زندگی میں تم ان کو نہیں چھو سکتے۔"

ایک عورت! کمزور عورت کے یہ الفاظ مجھے ناگوار معلوم ہوئے۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ مقابل کے کونے میں دیوار سے ٹکرا گئی۔ میں نے لپک کر تکیہ کے نیچے سے خط نکال لیے۔ وہ بھی بھوکی شیرنی کی طرح میری طرف آئی اور ہم دونوں میں چھینا جھپٹی... شروع ہوگئی۔ حتیٰ کہ میں ایک خط حاصل کر لینے میں کامیاب ہوگیا میں بھاگ کر چراغ کے قریب گیا اور اس کی مدھم روشنی میں پڑھا۔ اف! غضب خدا کا میرے اوپر گویا بجلی گر پڑی۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا وہ میرا ہی خط تھا۔ میرے دستخط موجود تھے ——— "انجم جمالی" القاب کی جگہ "پیاری رتن" تحریر تھا۔

اتنے میں صابرہ اپنے حواس درست کر کے قریب آگئی اور التجا کی کہ خط کا مضمون نہ پڑھوں۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"صابرہ! اس خط کا مکتوب الیہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"خود میں ہوں" اس نے اپنی ضرب خوردہ کلائی کو دباتے ہوئے جواب دیا "یہ میرا ہی نام ہے۔ خدا کے لئے مجھے واپس کردو۔ ورنہ میں اپنا خون کر ڈالوں گی۔"

"کیا تم ہی رتن بائی کے نام سے مضامین لکھتی رہی ہو" میں نے پرشوق لہجہ میں دریافت کیا۔

"ہاں!" اس نے حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا "میں رتن

بانی کے فرضی نام سے مضامین لکھتی تھی۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"
میرا گلا خشک ہوگیا۔ بڑی مشکل سے آواز نکل سکی "صابرہ! میں تمہارا انجم جمالی ہوں"۔
"ہیں! انجم جمالی"
"ہاں میری پیاری رتن! تمہارا انجم جمالی۔ صابرہ کا شمیم نہیں"۔
ہم دوڑ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور سیلاب اشک سے غبار کدورت کو دھو دیا۔ اس حجاب زندگی کا دور ہونا تھا کہ ہم پھر ایک ہوگئے۔ لیکن زیادہ استحکام اور یگانگت کے ساتھ اور آئندہ ہمارے افسانے "رتن جمالی" کے نام سے شائع ہونے لگے۔

فضل حق قریشی دہلوی

تمسخرِ حیات

شانتا! ....

تمہیں یاد نہیں شاید بھول گئیں دریائے راوی کے کنارے کی ملاقات تم گا رہی تھیں اور میں سن رہا تھا۔ تمہاری آواز کا رس میرے کان پی رہے تھے اور میری روح اس کی کیفیت سے مست ہو رہی تھی .... ایسی مستی جس کا آج تک اتار نصیب نہیں ہوا۔ گیت تم نے خود سنایا تھا میری فرمائش کے بغیر ....

پھر اب کیا ہو گیا ہے۔ وہی تم شانتا ہو اور وہی میں پر یتی جب شام کی سیاہی پھیلتے ہی کائنات ایک ٹھنڈا سانس لے کر خاموش ہو جاتی ہے۔ میرا دل، آرزوؤں سے لبریز دل اپنی ناکامیوں کے افسانے دہراتا ہے۔ آنکھیں بند کر لیتا ہوں ....

تمہارا خیال بندھ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میرے
پاس، پہلو میں .... دل میں بیٹھی ہوئی مسکرا رہی
ہو۔ مگر جب آنکھ کھولتا ہوں سائیں سائیں کرتی ہوئی رات کے
سوا کچھ نظر نہیں آتا ....

مایوس تمنا

پریمی"

لالہ فام اپنے مختصر سے آراستہ کمرے میں لیٹی ہوئی یہ خط بڑی دلچسپی
کے ساتھ پڑھ رہی ہے۔ ہر لفظ اور ہر فقرے پر اس کے چہرے کی شان
بدل جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ اس خط کے لکھنے والے سے اسکا
کوئی گہرا تعلق ہے "کس قدر دلفریب خط ہے یہ مصنوعی محبت کہیں رنگ
نہ لائے۔ خدا معلوم یہ کون ذات شریف ہیں .... خیر جو کچھ بھی ہو
یہ کہتی ہوئی مسہری سے اٹھی۔ مسکرائی، انگڑائی لی اور ایک چھوٹی سی
خوب صورت میز پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگی۔

لالہ فام اپنی زندگی کی چودہ منزلیں طے کر کے پچھلے ہی سال شباب
کے طلسم میں داخل ہوئی ہے۔ آزاد خیال ماں باپ کی لاڈلی بیٹی، حسن و
جمال کی ملکہ اور تعلیم یافتہ ہے۔ اچھے لباس کا شوق ہے۔ ساری خاص
طور پر پسند ہے۔ شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ ہر وقت ادب لطیف کا مشغلہ
رہتا ہے۔ ملنے جلنے کی چور ہے۔ ہوا خوری کو بھی کسی کے ساتھ نہیں
جاتی۔ کتاب کے سوا کوئی صحبت نہیں۔ مختلف ادبی رسالوں میں فطرت
کے مصوروں کی "شاہکاریاں" دیکھ دیکھ کر اس کو بھی شوق ہوا۔ چھوٹے
چھوٹے افسانے شروع کئے پھر "لیلےٰ کے خطوط" "رانجھا کے سندیسے"

پڑھتے پڑھتے دماغ نے اس طرف توجہ کی۔ فرضی نام سے ایک فرضی مخاطب قرار دے کر مصنوعی جذبات حسن وعشق پیدا کئے اور خطوں میں ان کا اظہار ہونے لگا۔ دو چار ہی ایسے خط نکلے تھے کہ ایک صاحب جواب دینے والے بھی پیدا ہو گئے رفتہ رفتہ اس مجاز میں کچھ حقیقت کی جھلک بھی پیدا ہونے لگی۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

کے رومی مقولے کے مصداق گفتار تو گفتار قلم کی ادبی رفتار نے دلوں میں ایک چینگ سی لگا دی۔ بغیر دیکھے، بلا تعارف، بے سمجھے بوجھے محبت کا آغاز ہو گیا اور ان ہی فرضی ناموں سے بذریعہ ڈاک نگا ہوں اور دلوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

پریم پجاری!

مجھ کو کیا یاد نہیں؟ سب کچھ یاد ہے۔ کہو تو کہوں۔ سنو تو سناؤں کاش یہ پردہ اٹھ جائے۔ کتنے خوش قسمت کہانیوں کے وہ لوگ ہوں گے جن کی زبان سے تم بولتے ہو جو اپنی محبت کا خراج تم سے لے رہے ہیں۔ .... تم سے بھی! انھیں کیا معلوم کہ تم کون ہو۔ کسی کو نہیں معلوم میں بھی نہیں جانتی۔ بتا دو...... بتا دو گے؟ ...... تشبیہوں، استعاروں اور گیتوں میں کب تک باتیں ہوں گی .... تم نے کبھی کوئی خواب دیکھا ہے ایسا خواب جو سچا ہوا ہو...... میں نے آج تک ایسا خواب نہیں دیکھا دنیا بھی ایک خواب

ہے۔ دلخو شکن بھی اور پریشان بھی۔لاعلمی کے اندھیرے میں اپنی بھی آنکھوں سے اوجھل سہی۔ مگر مجھ کو تم سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیئیں۔ یہ مانا کہ افسانوی باتیں ہیں پھر بھی تم مرد ہو میں عورت .... کہیں خفا نہ ہو جانا۔

تمہاری افسانوی

شانتا"

......تخیل کی دنیا میں باتیں کرتی ہو یا قلم سے چٹکیاں لیتی ہو۔جی چاہتا ہے اور بے اختیار چاہتا ہے ......تم ہو اور میں ہوں۔ افسانوں کی خلوت میں نہیں ......مگر تم...... بڑی ظالم ہو۔آخر یہ نقاب کیوں نہیں الٹتی۔ یہ برقع کیوں نہیں اترتا۔آج کل یہاں بہار ہے۔ ہماری چار دیواری تک بھی ہوا۔غریبوں کی ہمنوا پھولوں کی خبریں لے آتی ہے تم تو خود پھول ہو۔تم ہی سے بہار کا نام ہے ...... ایک باغ ہو پھولوں سے لدا ہوا۔ رنگینیوں کی نمائش گاہ۔نکہتوں کا عطر دان۔بلبل چہچہا رہے ہوں۔کوئی پھول چن رہا ہو اور کسی کی گود میں ڈالتا جاتا ہو .... پھر کیا چاہیئے۔ اللہ میں سب قدرت ہے ...... دعا .... آمین

پریم کا پیاسا

پریمی،

"من موہن!

بہار اس طرف کہاں؟ ہوگی جہاں ہوگی...... میں نے اب سے تمہارا نام برف رکھ دیا ہے۔ برف!...... خدا نے میرا دل بھی ایسا بنایا ہوتا۔ نہ کسی چیز کا اس پر اثر ہوتا۔ نہ محبت کا رنگ اس پر چڑھ سکتا۔ عورت ذات ہوں کمزور۔ اندر باہر ہر طرف سے کمزور۔ جب افسردہ ہوتی ہوں، جب اپنے جذبات کا قدردان نہیں ملتا تو مجھے اپنی بیچارگی اور مایوسی پر رونا آتا ہے بڑی آسانی سے میری اس بیکسی اور صنفی کمزوری سے کہیں کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھالے۔ کبھی شرمندہ ہونا پڑے۔ اس لئے —— تم کیا جانو کہ میں کون ہوں؟ کیسی ہوں؟ اور...... تم اپنا رومانی پردہ کیوں نہیں اٹھا دیتے...... ماشاء اللہ مرد ہو۔ جرأت مردانہ سے کام لو۔ محبت کی بھکارن

شانتا"

"...... ایک محبت کے راستے سے بھٹکے ہوئے کو زیادہ نہ بھٹکاؤ۔ ٹوٹے ہوئے دل کو بچا کر نہ دیکھو۔ حسرتوں سے لبریز ماضی نے میرے مستقبل کو بھی تاریک کرنے کی ٹھان لی ہے...... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ سنتی ہو شانتا میرے پریم مندر کی دیوی —— لیکن تمہیں میری کیا ضرورت...... پیاس کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی کو پیاس کی کیا پروا۔ بلبل کو پھول کا عشق ہے، پھول کو بلبل سے کیا۔ چکور چاند پہ صدقہ ہوتا ہے۔

چاند کو چکور سے کیا۔ میں تمہارا اور تمہاری یاد کا شکر گذار ہوں۔ تم مجھے بھلا سکتی تھیں۔ تمہارے گرد و پیش ایسے اسباب ہوں گے مجھ کو یقین ہے تمہاری طرف سے آنے والی ہوائیں خوشبو سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں جاگتے میں بھی اور سوتے میں بھی۔ دور۔ بہت دور۔ کہیں جہاں میری نظر نہیں پہنچ سکتی کہ دو کٹورا سی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ چھلکنے کی دیر ہے ...... تم گھبرا گئی ہو۔ مایوس ارمانوں کی بھیڑ سے محبت کی بیرحمیوں سے، جدائی کی طوالت سے بے قرار ہو کہ اس رومانی خواب کی تعبیر ہے۔ رو نہیں شانتا رو نہیں۔ یہ آنکھیں رونے کے لئے نہیں بنائی گئی ہیں۔ یہ بنائی گئی ہیں کسی آپ ہی کے ملنے کی خواہش میں مسکرانے کو۔ اس افسانے کو بڑھ جانے دو اس کہانی میں اثر آنے دو۔ ہم ملیں گے ایک دن ضرور ملیں گے دلوں میں راہ پیدا ہو چکی ہے۔ وقت کی دیر ہے جس کا انتظار کرنا چاہئے

تمہارا

پریمی "

~~~~~~~~~~~~

یہ اور اس قسم کے اکثر خطوط شانتا اور پریمی کے فرضی ناموں سے گل و بلبل میں ہر مہینے شائع ہوتے رہے ..... لوگوں نے مزے لے لے کر پڑھے۔ لیکن جن دو دلوں میں ان افسانوی شاہکاروں نے ایک خاص تعلق پیدا کر دیا تھا اس سے دنیا بے خبر تھی۔ گل و بلبل کے شاعرانہ راز و نیاز سے تمسخر کرنے والے کیا جانیں کہ خیالی آگ بھی شعلے دینے لگتی ہے۔ فرضی عشق بھی....
~~~~~~~~~~~~

حقیقت بن جاتا ہے۔ یکایک خاموشی چھا جاتی ہے۔ یہ سلسلہ خود بخود بند ہو جاتا ہے کیوں؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

چند روز بعد الہ آباد کے اسٹیشن پہ ایک نوجوان، خوب صورت، سبزہ آغاز کوٹ پتلون پہنے، ہیٹ لگائے آنے والی ٹرین کا منتظر ہے۔ کبھی ادھر جاتا ہے کبھی اُدھر کہ ایک حسینہ سرخ ساری میں ملبوس ویٹنگ روم سے نکلتی ہے اور نوجوان کے سامنے سے گذر جاتی ہے پچیس تیس قدم جا کر پھر واپس آتی ہے اور نوجوان پہ ایک سرسری نگاہ ڈالتی ہوئی ویٹنگ روم میں چلی جاتی ہے۔ نوجوان کی نظریں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ وہ ایک پھریری لیتا ہے اور دل میں پیدا ہونے والے کسی جذبہ کو دبانے کے لئے جلدی جلدی ٹہلنے لگتا ہے۔ اتنے میں قلیوں کا شور ہوتا ہے۔ بیٹھے ہوئے مسافر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ٹرین آتی ہے۔ آنے والے مسافر اترتے ہیں، جانے والے سوار ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان بھی سامنے کے بینچ سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتا ہے اور سکنڈ کلاس کے ایک درجہ میں سوار ہو جاتا ہے۔ درجہ خالی ہے اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے اور پلیٹ فارم پر مسافروں کی چپقلش کا تماشا دیکھنے لگتا ہے کہ ساری والی حسینہ قلی کے سر پر سامان رکھوائے ویٹنگ روم سے نکل کر آتی ہے اور گاڑیوں میں جگہ تلاش کرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ اس درجہ کے سوا جس میں یہ نوجوان ہے سکنڈ کلاس کے کسی درجہ میں جگہ نہیں ملتی یا لیڈیز کمپارٹمنٹ کی جستجو ہے جو نظر نہیں آتا۔ آخر کار قلی اس نوجوان والے درجہ کے سامنے لاکر بتاتا ہے کہ حضور زنانہ ڈبہ تو یہی ہے۔ وہ درجہ پر لگے ہوئے بورڈ کو پڑھتی ہے جو صرف عورتوں کے واسطے ہے مگر نوجوان کو اس میں دیکھ کر پریشان ہے۔

"آپ اس میں کس طرح بیٹھ گئے۔ یہ تو زنانی گاڑی ہے۔ کیا آپ نے اس پر لگے ہوئے تختے کو پڑھا نہیں؟" انجن سیٹی دیتا ہے۔ ٹرین کو جنبش ہوتی ہے۔

"معاف کیجئے گا مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن اب وقت نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیں۔ میں اگلے اسٹیشن پر دوسری گاڑی میں چلا جاؤنگا۔"

سامان جوں توں کر کے رکھا جاتا ہے اور حسینہ بھی سوار ہو جاتی ہے اب ایک سیٹ پر نوجوان ہے دوسری پر حسینہ۔ نوجوان شرمندہ سا معلوم ہوتا ہے اور حسینہ پریشان سی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ چند منٹ کی بات ہے، غالباً آپ کو تکلیف نہ ہوگی"۔ حسینہ نے نوجوان کی طرف غور سے دیکھا۔ ساڑی سنبھال رومال سے منہ پونچھا "کچھ ہرج نہیں۔ ایسی غلطی اکثر ہو جایا کرتی ہے۔ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

نوجوان:۔ "بنارس" یہ کہہ کر نوجوان نے "گل و بلبل" کا تازہ رسالہ اپنے ہینڈ بیگ سے نکالا اور بے توجہی کا اظہار کرنے کے لئے اسے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن یہ نظر بازی کا صرف بہانہ تھا۔ دل اور نگاہیں دونوں حسینہ کی طرف تھیں۔

حسینہ:۔ یہ کیا رسالہ ہے؟ گل و بلبل! کیا آپ اس کے خریدار ہیں؟

نوجوان:۔ جی ہاں! خریدار بھی اور . . . . .

حسینہ:۔ اور کیا؟

نوجوان:۔ میرے افسانے بھی اس میں نکلا کرتے ہیں۔

حسینہ:۔ اوہو! آپ افسانہ نگار بھی ہیں؟

نوجوان :۔ موجودہ رسالوں میں بہترین رسالہ ہے۔ بعض ادبی شاہکار تو اس میں غضب کے نکل چکے ہیں۔

حسینہ :۔ مثلاً۔ یہ میں اس لئے پوچھتی ہوں کہ میں بھی اس کی قدردان ہوں۔

نوجوان :۔ مثلاً افسانوی خطوط جن کا سلسلہ دو مہینے سے بند ہے۔ خدا معلوم ان کے لکھنے والوں نے ایسا کیوں کیا۔

حسینہ کی نگاہیں جھک گئیں، اس کا دل دھڑکنے لگا۔

حسینہ :۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان خطوط کے لکھنے والے کون تھے؟ میری کوشش تو ناکام رہی۔

اس فقرے نے نوجوان کے دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سینکڑوں رومانی تصویریں آئیں اور گذر گئیں اس کا دماغ فانوس خیال بن گیا۔

نوجوان :۔ پریتی اور شانتا۔ یہی نام تھے نا جن کے وہ خطوط ہوتے تھے۔

حسینہ :۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ یہ نام فرضی ہیں یا اصلی؟

نوجوان :۔ میں تو فرضی سمجھتا ہوں۔

حسینہ :۔ میری رائے بھی یہی ہے۔ اچھا ان دونوں میں کوئی حقیقی تعلق بھی تھا یا محض شاعری تھی۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

نوجوان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔

نوجوان :۔ میں۔ میں خیال کرتا ہوں۔ صرف میرا اپنا خیال ہے..... کہ ابتدا میں محض شاعری تھی۔ لکھنے والے نے افسانہ کو ایک نیا رنگ دینا چاہا تھا...... لیکن...... لیکن......

حسینہ:۔ لیکن! کہیے رک کیوں گئے؟
نوجوان:۔ لیکن...... رفتہ رفتہ شاعری مصوری بن گئی۔ خیالی جذبات نے واقعی صورت اختیار کر لی۔
حسینہ:۔ یعنی؟
نوجوان:۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پہلا خط شانتا کے نام سے شائع ہوا تھا۔
حسینہ:۔ ہاں پہلے تین خط شانتا ہی کے چھپے تھے۔
نوجوان:۔ چوتھا خط پریمی کا نکلا۔ گویا شانتا کے رومانی جذبات میں ایک اور شخص نے بھی حصہ لیا اور پھر دونوں طرف سے محبت کا تبادلہ ہوتا رہا۔
حسینہ:۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی شخص دو مختلف ناموں سے لکھتا رہا ہو یا اگر دو الگ الگ شخصیتیں ہوں تو یہ کیا ضروری ہے کہ ایک مرد ہو اور ایک عورت نوجوان اس استدلال سے کسی قدر جھینپا اور زانو بدل کر مسکرایا۔
نوجوان:۔ آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے۔ یہ دونوں باتیں ہوسکتی ہیں مگر یہ تو میں دعوے سے کہوں گا کہ پریمی اور شانتا ایک نہیں ہیں۔ ہاں اس کی بظاہر میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ شانتا مرد ہے یا عورت۔
حسینہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنے تیور پر بل ڈال لیے۔
حسینہ:۔ بظاہر کوئی دلیل نہیں ہے تو آپ کی ساری منطق بیکار ہو گئی۔
نوجوان:۔ منطق تو میں جانتا نہیں۔ لیکن جس طرح مجھے یہ یقین ہے کہ شانتا اور پریمی ایک نہیں ہیں اسی طرح میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شانتا مرد نہیں عورت ہے اور عورت بھی نوجوان، حسین اور پریمی کی جوڑ۔
حسینہ نے ایک ایسی نظر سے نوجوان کی طرف دیکھا جس میں ہزاروں

شرارتیں لاکھوں کرشمے اور واردات قلب کا ایک خزانہ مخفی تھا۔ نوجوان پر بھی ایک مذبوحی کیفیت طاری تھی دونوں ہاتھوں سے کلیجہ پکڑے بیٹھا تھا

حسینہ :۔ آپ کے اس بے دلیل دعوے کو میں کس طرح مان لوں۔

نوجوان :۔ میں ثابت کر سکتا ہوں۔

حسینہ :۔ بسم اللہ ثابت کیجئے۔ پھر مجھے مان لینے میں کیا عذر ہوگا۔

نوجوان :۔ آپ ضد کرتی ہیں تو سنئے۔ پریمی میں ہوں۔ افسانوں کے لئے میں نے اپنا نام پریمی اختیار کیا ہے۔

حسینہ کے دماغ میں نامعلوم خوشیوں۔ موہوم امیدوں۔ خیالی ارمانوں اور مستقبل کے حسین تصورات کا ہجوم ہوگیا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس غیر مترقبہ ملاقات کا کیا نتیجہ ہوگا۔ اس کے دل میں یہ شک بھی پیدا ہوا کہ کہیں مجھے دھوکا تو نہیں دیا جا رہا ہے اور اس خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑی۔ انتہائی روحانی اذیت محسوس ہوئی۔ اس نے نوجوان کو بغور دیکھا۔ پھر دیکھا۔ یہ جمیل پیکر یہ معصوم آنکھیں، یہ شیریں آواز فریبی نہیں ہو سکتی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اگر ان پیارے پیارے ہونٹوں سے محبت کا سوال کیا جائے تو جواب بھی محبت سے دینا چاہیئے۔

حسینہ :۔ پھر تو آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں اور میں خوش قسمت کہ راہ چلتے ایک روحانی ہستی سے ملاقات ہوگئی۔

نوجوان :۔ لیکن ریل کی ملاقات ہے اس کی ساری باتیں صرف تفریحاً ہوا کرتی ہیں۔

حسینہ :۔ عموماً۔ اگر آپ چاہیں گے تو اس میں خصوصیت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

نوجوان :۔ ایسے میرے کہاں نصیب کہ آپ جیسی خاتون مجھے نیازمندی کا موقع دے۔ میرا اصلی نام آفتاب ہے اور نمبر ۱۰ لاٹوش روڈ الہ آباد میرا پتہ ہے اگر اس بر سرِ راہ ملاقات کو آپ کوئی اہمیت دینا پسند کریں تو....

حسینہ :۔ میں دہلی جا رہی ہوں۔ وہی میرا وطن ہے۔ آزاد ہوں اپنی مرضی کی مالک اور دولت مند بھی، لالہ فام میرا نام اور خط پر صرف "گلستان دہلی" لکھ دینا کافی ہے۔

گاڑی رکی اور نوجوان پریمی یا آفتاب جلدی سے اترا اور ایک مردانہ درجہ میں سوار ہو گیا۔ آفتاب ایک ہندوستانی ایرانی نسل کا نوجوان تھا۔ بی اے کے بعد کچھ تو غرورِ حسن اور کچھ مزاج کی وارفتگی نے تعلیم کا سلسلہ بند کر دیا اور اب تقریباً ایک سال سے دن اسباب تفریح کی فراہمی اور رات حسن و عشق کی جلوہ گاہوں میں گذرتی تھی۔ لیکن آوارگی کے تمام سامان کافی سے زیادہ مہیا ہونے کے باوجود آفتاب کی جوانی اب تک بے داغ تھی۔

آفتاب کو بنارس سے الہ آباد آئے ہوئے کئی دن گذر چکے ہیں چہرے پر وہ پہلی سی بشاشت نہیں۔ معمولات میں بھی فرق ہے۔ یاروں میں بیٹھ کر چہچہوں اور قہقہوں کے بدلے اب چپکے چپکے اپنے دل سے باتیں ہوتی ہیں سارا سارا دن اپنے کمرے میں تنہا کواڑ بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ رات رات بھر اپنی وسیع کوٹھی کے چمن میں ٹہلا کرتا ہے۔ کبھی رات کو کبھی دن میں کچھ لکھنے بیٹھتا ہے۔ غالباً خط لکھتا ہے۔ پڑھتا ہے اور پھاڑ ڈالتا ہے۔ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی کبھی آنسو کا ایک قطرہ بھی ٹپک جاتا ہے۔ آخر ایک روز جرأت کر کے خط لکھ ہی ڈالا۔ مضمون تھا:۔

"آپ کو کس طرح مخاطب کروں۔ محترمہ لکھ نہیں سکتا کہ اجنبیت

ظاہر ہوتی ہے۔ ڈیر کی عمومیت میری نیاز مندی کا درجہ پست کر دے گی۔ نام اور صرف نام لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مزاج شناس ہوں اس لئے ڈرتا ہوں۔ آئندہ اگر آپ نے جرأت دلائی اور میں بے تکلف بھی ہوگیا تو دیکھا جائیگا۔ میں بنارس اترا اور ٹرین آپ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے دہلی روانہ ہوئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا "جھونکا تھا اک نسیم کا آیا گذر گیا" میرے جسم میں ایک نئی روح پیدا ہوئی تھی چند گھنٹوں کے لئے اور وہ نکل گئی۔ یہ عقل و ہوش کی دنیا بھی کس قدر تکلیف و آزار کی دنیا ہے۔ راحت اور شانتی کے لئے احمق اور بیوقوف بن کر رہنا چاہیئے۔ سکون کی ضرورت ہے تو آؤ دل و دماغ کا سرمایہ ایک "ہو" سے بدل ڈالیں .... خدا کرے کہ "بر سر راہے" ایسا موقع پھر ملے۔ اچھا سلام

منتظر جواب

آفتاب

تیسرے دن جواب آیا:۔

آفتاب! نام لے کر مخاطب کرنا مجھ کو پسند ہے۔ لیکن نام لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں تمہارا نام لے کر تمہاری خوشی کو پورا کرتی ہوں آپ کی متانت بھی مجھے اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ "تم" میں جو بے تکلفی اور مزہ ہے وہ "آپ" میں کہاں؟ ..... بہر حال یاد آوری کا شکریہ .... "حسن رہگزرے" کو دوبارہ دیکھنے کے لئے کس کا دل نہیں چاہتا اور جب روشناسی بھی ہو جائے تو پھر؟ تم مرد ہو جنسِ کامل، صنفِ قوی۔ میں عورت ہوں ناقص، نازک۔ تم کو

یہ کہتے ہوئے کچھ وہم نہیں آیا کہ آؤ دیوانے بن جائیں۔ دیوانوں کی سی باتیں کریں .... جاؤ بھی مختار ہو کر مجبور بنتے ہو۔ تدبیر سے پہلے تقدیر کے حوالے ہوئے جاتے ہو .... دل میں اگر خواہش ہے اور خواہش میں صداقت تو "وہ تاک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے" ..... کیا سب کچھ ممکن ہے مگر تم افسانوی آدمی ...... جرأت رندانہ کیا جانو ...... اچھا اب رخصت ......

لالہ فام

لالہ فام! بے تکلفی اور رسمیات کی پابندیوں سے آزادی کا فیصلہ ہو ہی چکا ہے وہ بھی میری طرف سے نہیں تمہاری طرف سی لیکن کیا کہوں جو کچھ دل کہنا چاہتا ہے جس کو دل کی ترجمانی کہنا چاہیئے۔ وہ بات .... کیونکر کہوں کہ جی ڈرتا ہے کیا تم اجازت دوگی کہ میں تم کو اپنے افسانوں کی کوئی .... تصور کر لوں۔ اپنے افسانوں کی روح رواں تم کو سمجھ لوں۔ اگر یہ چیز میسر ہو جائے تو میرے افسانوں میں حقیقت پیدا ہو سکتی ہے کچھ تم نے سنا؟ جواب دو۔ مسکرانے کی سہی نہیں۔ افسانوں کی دنیا سے باہر آؤ تو جہاں کا جہاں سے مقابلہ ہو۔ ورنہ زندگی گونگے کا خواب ہے اور کچھ نہیں۔ والسلام۔

تمہارا
آفتاب

آفتاب! خدا سے ڈرو۔ مجھ کو اپنے جھوٹے من گھڑت افسانوں سے حسین مخلوق بنانا چاہتے ہو۔ مجھ کو میری جنس کی تمام عریانیوں میں دیکھنا پسند کرتے ہو۔ یہ تمہارا افسانوی مطمع نظر ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں تو منہ ڈالو........ بڑے ستم ظریف ہو آفتاب .... میں خوب صورت ہوں۔ ہوں تو کیا ہوا۔ مجھے کسی محبوب کی ضرورت نہیں۔ جمال کا جمال سے مقابلہ۔ یہ تم نے خوب کہا۔ تم اپنی جوانی اپنے حسن کا مجھ پر رعب ڈالنا چاہتے ہو۔ تمہارے خیال میں شاید میں کسی کے...... کسی کے دل کو اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ اور وہ بھی ایسے رومانی شخص کے دل کو جس کی دنیا افسانہ ہی افسانہ ہو۔ سن لیا..... افسانہ نویس حسن و محبت کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلنا اپنا کمال سمجھتے ہیں یہ ان کی نادانی ہے اور تمہاری بھی۔

لالہ فام"

لالہ فام! غصہ کا کیا کام اور پھر غصہ بھی ایسا حسین دیکھ لے تو ہونٹ پھڑکنے لگیں۔ محبت کیا ہے؟ میں واقف نہیں۔ حسن کو اس کی کس حد تک ضرورت ہے میں نہیں جانتا۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ دلربائی کے وہ کیا انداز ہیں جن سے دوسروں کو پھنسایا جاتا ہے لیکن با ایں ہمہ لاعلمی میں یہ سمجھتا ہوں اور یقیناً صحیح سمجھتا ہوں کہ زندگی کبھی تنہا بسر نہیں ہو سکتی...... کیا تم نے کبھی اس مسئلہ پر غور نہ کیا ہوگا۔ ٹھنڈے دل سے جواب دو........ رفیق حیات کا پیدا کرنا انسانی فطرت ہے۔ میں بھی اگر اس کا متلاشی

ہوں تو کیا گناہ .... تمھاری نظر میں میرا یہ نیا افسانۂ تخیل ہے تو تم اپنے معصومیت کے صدقے اس میں اصلیت کا رنگ بھر دو ......

"آفتاب

...... آخر ان کج بحثیوں کا مطلب ؟ کیا اپنے کسی افسانہ کے لئے مواد فراہم کر رہے ہو۔ یا یہ منشا ہے کہ میں تمہاری باتوں پر ریجھ کر تمہاری محبت کا اقرار کر لوں اور تمہارے جذبات کا شکار ہو جاؤں۔ اگر پہلا مقصد ہے تو صاف کہہ دو اور جواب بھی سن لو کہ میں تمہارے رومان کی دلچسپی کا سامان نہیں بن سکتی۔ ہاں دوسری صورت میں مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔ بشرطیکہ تم اپنی صداقت اور پاکیزگی کا ثبوت پیش کر سکو۔ جوانی کی ترنگ اور حسن کی شوخیاں تم پر مسلط نہ ہوں۔ مجھ کو مجبور محبت سمجھ کر خوش نہ ہو جانا۔ عجلت کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا کرتا۔ ...... پھر کہیں ملاقات ہو۔ آمنے سامنے بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کی ضرورت ہے۔ مجھ سے دریافت کرنا فضول ہے۔ جب چاہو ...... مجھے ہر وقت تیار پاؤ گے .... بس اب تو چین آیا۔

لالہ فام

دو ہفتے کی خاموشی کے بعد آفتاب کی طرف سے لالہ فام کے نام یہ مختصر خط آتا ہے:-

"...... پندرہ دن تک میرا خاموش رہنا تمہارے شبہات

کے لیے کافی ہے۔
مگر میں اپنے اندر ایک فیصلہ کن جنگ کا آخری نتیجہ دیکھنا چاہتا تھا ..... میرا مصمم ارادہ ہے کہ اپنی خواہشات اصالتاً پیش کروں۔ آج سے آٹھویں روز دھلی پہنچوں گا۔ کیا تم میرا انتظار کروگی ؟

"آفتاب"

لالہ فام نے سینکڑوں مرتبہ اس خط کو پڑھا۔ ہر مرتبہ اس کے چہرے کی کیفیت بدل جاتی تھی۔ وہ اپنی اس فتح پر مغرور ہو چلی۔ لیکن صنفی کمزوری نے اس کی آنکھیں نیچی کردیں۔ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوگئی۔ اس خط کا جواب دینا ضروری نہ تھا اور نہ اس میں جواب طلب کوئی بات تھی۔ لیکن اس کی بیقراریوں نے اس کا جواب بھی لکھوایا۔ اس نے لکھا :۔

"........ تم نے اس خط میں وہ بات لکھی ہے کہ اب کیا کہوں، نہ آنکھوں کو اعتبار نہ دل کو یقین۔ چاہتی ہوں کہ پھر تصدیق ہو جائے۔ کیا سچ مچ آرہے ہو۔ میرے لیے۔ مجھ سے ملنے کو ...... مذاق تو نہیں کرتے۔ میرا امتحان تو نہیں لیتے ...... تمہاری جدائی کی ہمت نہیں۔ تمہارے دیدار کی طاقت نہیں۔ لیکن پھر بھی آرزو ہے کہ آؤ اور جلدی آؤ.... تمہیں معلوم ہے کہ میرے پچھلے دن کیسی مایوسی میں گذرے ہیں اس لیے مجھے تو شاید اس وقت بھی یقین نہ آئے جب تم میرے سامنے ہو۔ آنکھیں تمھیں دیکھیں اور کان تمہاری باتیں

نہیں۔ اچھا تو بتاؤ کس دن کس وقت یہ نعمت مجھے ملے گی؟

"لالہ فام"

دوپہر کو آفتاب کا تار لالہ فام کو ملتا ہے اور رات کے نو بجے کوٹھی کے احاطے میں موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ پانچ منٹ بعد مخملی صوفے پہ آفتاب اور لالہ فام حسن و محبت کے دو پیکر پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں۔
ملاقات کا یہ دور جمیل باشوق و ارمان کا تصادم۔ دھڑکتے ہوئے دلوں مسکراتی ہوئی آنکھوں۔ پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے شروع ہوتا ہے اور باتوں رنگین باتوں۔ چمن کی گلگشتوں۔ آرزوؤں کے سبز باغوں۔ فردوسی زندگیوں کی تمناؤں اور محبت کی خوشنما سیرگاہوں سے گذرتی ہوئی ایک مختصر محفل میں ایک جبہ در بر، عمامہ بر سر مولوی صاحب کی آمد پہ پھولوں کے سایہ میں ختم ہوتی ہے اور ازدواجی رشتوں میں قید ہو کر ایک ہفتہ کے اندر اندر میاں آفتاب اپنی دلھن لالہ فام کے ساتھ دہلی سے الہ آباد روانہ ہو جاتے ہیں۔

حسن و عشق ہم آغوش ہو چکے ہیں۔ ظاہر و باطن تصورات کی دنیا آباد ہے۔ موانست کے بعد مواصلت نے سارے حجاب اٹھا دئے ہیں۔ آفتاب کے بنگلہ کے ہر گوشہ میں زہرہ کا معبد بن گیا ہے۔ ہر وقت حسن کی پرستش ہوتی ہے۔ کائنات کی مسرتیں لالہ فام کے جہیز میں آگئی ہیں ہنسی ہے، چہل ہے، پیار کی باتیں ہیں۔ عید کے دن ہیں شب برات کی راتیں ہیں۔
ایک سال گذر گیا۔ جوانی کی رنگینیوں۔ حسن کی دلفریبیوں اور محبت کے اندھے نغموں میں معلوم بھی نہ ہوا۔ لیکن جب جذبات میں ناز کی گنجائش

نہ رہی شوق پرانا ہوگیا۔ ارمانوں میں کوئی ندرت پیدا نہ ہوسکی۔ افسانوی زندگی روزمرہ ہوگئی تو تصویر کا دوسرا رخ سامنے آیا۔ لالہ فام اور آفتاب دونوں اپنی اپنی جگہ خود نما، مغرور، آزاد اور بدمزاج ثابت ہوئے۔ محبت کا احترام اور ازدواجی عہد و پیمان کا ایفا نظرانداز کردیا گیا۔

جو چیز جس قدر جلدی اور کم محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی قدر ناپائدار بھی ہوتی ہے۔ لالہ فام اور آفتاب کے تعلقات میں بھی یہی کمزوری تھی۔ دوسرے عورت و مرد میں خواہ ان کا تعلق ازدواجی ہو خواہ محض دل لگی باہمی کش مکش کا سبب عورت کا جذبۂ رشک اور مرد کی تحکمانہ خصلت ہے وہ اس کوشش میں کہ مرد اس کا حلقہ بگوش غلام بن جائے اس کی جائز تفریحوں اور ضروری آزادیوں میں دخل دینے لگتی ہے اور جاسوس بن کر اپنا وقار نسائیت کھو دیتی ہے۔ اسی طرح مرد اس گمان میں کہ عورت اسکی زرخرید لونڈی، اس کے عیش کا ایک آلہ اور اس کی محبت کے کھیلنے کا ایک کھلونہ ہے۔ اس کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا۔ اپنی جھوٹی برتری جتانے کے لیے اس کو اپنی اصلی سطح سے گرانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرفین میں مناقشت پیدا ہو جاتی ہے۔ مناقشت کے بعد ضد اور جب کام اس سے بھی بڑھ جاتا ہے تو فریقین اپنے اندر ایک قسم کی کیفیت احتراز محسوس کرنے لگتے ہیں۔

لالہ فام اور آفتاب بھی اسی قسم کی محبت کا شکار تھے اور آخرکار نتیجہ بھی یہی نکلا کہ ہلکے ہلکے گناہ اور چھوٹی چھوٹی خطائیں ہوتے ہوتے ایک بڑے گناہ اور بڑی خطا کی نوبت آگئی۔ رنجش بے جا نے بڑھتے بڑھتے مفارقت کے لیے تیار کردیا اور لالہ فام چند فقروں کا ایک خط آفتاب کے کمرے میں رکھکر

اپنے وطن دہلی روانہ ہو گئی۔ بغیر اجازت۔ بلا اطلاع۔
آفتاب لالہ فام کی روانگی کے کئی گھنٹے بعد جب گھر پہنچا تو ملازمین نے بیگم صاحبہ کے دہلی تشریف لے جانے کی اطلاع دی۔ کمرے میں گیا تو خط ملا...... لکھا تھا:۔

آفتاب! اس وقت سے پہلے کہ ہماری محبت منافرت میں بدل جائے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے گھر چلی جاؤں۔ تمہاری بے اعتنائیاں مجھ سے برداشت نہ ہوں گی۔ در حقیقت ہماری جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ میں تمہارے عیش میں مخل تھی۔ مجھ کو ہٹ جانا چاہیئے تھا تاکہ تم بالکل آزاد ہو کر رہو۔ چنانچہ میں ہٹ گئی۔ اب تم بے روک ٹوک اپنی نفسانی خواہشات پوری کر سکتے ہو۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ میں بھی کوشش کروں گی کہ تمھیں بھلا دوں۔

"لالہ فام"

آفتاب کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگی۔ لیکن اس قدر کہ وہ ایک گہرا سانس لے کر پلنگ پر جا لیٹا اور اپنے دل کو ٹٹولتا رہا۔ صبح کو اٹھا تو ایک انفعالی کیفیت کے سوا اس کے دماغ میں کچھ نہ تھا۔ لالہ فام کی رعنائیوں سے وہ ایسا سیر ہو چکا تھا کہ اس نے بیوی کی حیثیت سے بھی اس کی کوئی پروا نہیں کی اور اس خط کو لاپرواہی سے میز کی دراز میں ڈال دیا اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔

لالہ فام اپنی کاوش پسندی اور نسوانی انداز کے ماتحت آفتاب کو الوداع کہہ تو آئی اور ریل میں بیٹھ کر اپنے گھر آ بھی گئی۔ لیکن پریشان بھی تھی اور پشیمان بھی۔ عورت ذات، پھر جوان بھی اور خوب صورت بھی۔ شادی شدہ بھی۔ اکیلی رہ کر دہلی والوں کے طعنوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتی تھی۔ واقعہ طلب لوگوں کی بدگمانیوں سے کیونکر بچ سکتی تھی۔ دو چار دن تو اس نے اپنے اجڑے ہوئے مکان کی آراستگی میں رہ کر کاٹے۔ اس کے بعد وہ تھی اور اس کے پراگندہ خیالات۔ افسوس اور اپنی غلطی کا احساس۔ کبھی تو وہ یہ خیال کرتی کہ میں نے کیوں اس قدر ناعاقبت اندیشی سے کام لیا اتنے دن کی رفاقت کو ایک دم سے ترک کر دیا۔ مجھ کو صرف اس یقین پر قانع رہ کر کہ انھیں مجھ سے محبت تھی مسرور رہنا چاہیے اور کبھی اس خوف سے کانپ اٹھتی کہ لوگ میرے اس طرح آنے اور آفتاب سے علیحدہ رہنے پر کیا کہیں گے۔ کتنی غیرت کی بات ہے۔ یہ پہاڑ سے دن اور یہ اندھیری راتیں آخر کیسے گذریں گی۔ باوجود خیالات کی ان کمزوریوں کے لالہ فام اعتراف شکست بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو کسی حالت میں بھی آفتاب کے سامنے جھکنا گوارا نہ تھا۔ وہ خوشی خوشی چلی جاتی اگر آفتاب دہلی آکر اس کو لے جاتا۔ وہ ہزار مرتبہ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتی اگر ایک مرتبہ آفتاب اس کا منہ چوم لیتا اس کے دل سے سارا غصہ جاتا رہتا۔ لیکن محبوب کی شان باقی تھی۔

غم غلط کرنے اور ایک مشغلہ کے طور پر لالہ فام نے پھر افسانوی خطوط کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور آفتاب کو متوجہ کرنے کے لیے اس کے نزدیک یہی ایک تدبیر تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی خط کے بعد یہی افسانہ میر

موجود تھے۔

شانتا! آج دو سال بعد زیارت نصیب ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ سے دلچسپ کوئی دنیا تھی۔ جس میں اتنے عرصہ تک آپ رہیں۔ کیوں؟ یہ آپ کے سانسوں سے بوئے سوز کیسی آرہی ہے۔ کیا میں آپ کے درد کا شریک بن سکتا ہوں؟..... اچھا تو آپ میرے درد کے شریک بن جائیں۔ کیا فرماتے ہیں علمار دین...... میری محبت مایوس ہوکر آج پھر امید واری کے لئے تیار ہوگئی ہے۔ تزئین جمال کی خدمت سپرد کر دیجئے۔ شاید حریص سمجھ کر آپ نے میرے سارے ارمانوں تمام آرزوؤں کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دیا تھا۔ کیا اب بھی میں حریص ہوں۔ آپ نے دیکھا کہ جیسا پریمی پہلے تھا ویسا ہی پریمی اب بھی ہوں اور رہوں گا بھی۔

ہمیشہ آپ کا

پریمی "

جواب تھا:۔

پریمی! تقدیر بگڑ لی ہے تو ہر چیز بگڑ جاتی ہے..... کیا کہوں محبت نے جو انگڑائی لی تھی وہ خمار آلود ثابت ہوئی۔ شباب کی شوخیاں کند ہوکر رہ گئیں....... نگاہیں بیباک تھیں دل بیتاب اور زبانیں خاموش، پھر پیغام...... ملاقاتیں ...... اس کے بعد....... دن خوشی و سرور سے

پرکیف .... راتیں انبساط ونشاط سے سرشار
.... پھر حسن کا حسن سے تصادم ...... محبت سے
محبت کی ٹکر .... کمزوریوں کا کمزوریوں سے مقابلہ
.... بے جا خودداریاں ...... آہ زندگی کا بجھا
ہوا ترنم، موسیقی سے لبریز ساز خاموش ہوگیا۔ بھولنے
والے .... بھلا دینے والے .... یاد
فراموش ..... کچھ یاد ہے ...... اور ...... اور
.... اب کیا کہوں ۔

"شانتا"

آفتاب یہ خط دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اس کو اس آئینہ میں اپنی اور لالہ فام کی تصویر پہلو بہ پہلو نظر آئی۔ مایوس نگاہوں، اشک آلود آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ آخر یہ شانتا کون ہے؟ اور اس کا یہ رومان کیسا ہے؟ اگلی اشاعت میں اس کا پہلا خط نکلا۔

شانتا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو اور میں کیا سن رہا ہوں ..... ہر افسانہ ایک ہی قسم کے جذبات کا خاکہ ہوتا ہے۔ لیکن اس قدر واقعات اتحاد بھی ان میں نہیں ہوتا۔ ہاں تو تم ..... میں سمجھتا ہوں ایک ناکام محبت ہو۔ میری طرح تمھاری محبت کی قدر نہیں کی گئی ...... میں بھی تمھاری جیسی ایک خوبصورت نسائیت سے اغماز کرچکا ہوں اور اس لیے پشیمان ہوں۔ اس سے بھی اور تم سے بھی۔ میرے جنسی تکبر نے مجھے بالکل

بے اعتبار کردیا...... اقرار جرم کرنے کے بعد میں اب کس منھ سے وہ گیت سناؤں جو نوحہ بن چکا ہے۔ تم سنوگی۔ لیکن وہ محبت نہ تھی محبت کا ایک ہیولا تھا۔ تمھاری محبت کے لئے ایک زیر مشق تھی۔ اگر تم یقین کرو۔ اگر تمھیں یقین ہو تو میں کہوں کہ میری محبت کی پیاس پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی اور یہ صرف تمھارے پنگھٹ پر بجھ سکتی ہے۔

تیرا ہی
"آفتاب"

لالہ فام کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط کا مضمون وہی تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں آفتاب کی خودداری کو شکست دینے والے انتقام کی لہر اٹھی۔ اس نے اپنے شکار کو دو چار جھٹکے اور دینے چاہے۔ لیکن کسی خیال سے لرز گئی۔ وہ اب زیادہ صبر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جواب لکھا:۔

پریمی! تم اکتا گئے ہو گے اس طویل داستان عشق اور روداد ہجر کو پڑھتے پڑھتے مگر پڑھ لو یہ سمجھ کر کہ ایک مظلوم اور بے بس عورت یہی کر سکتی ہے۔ اسی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ وہ مستحق ہے اپنا درد دل کہنے کیلئے اور مرد سننے کے لئے مجبور۔ اس لئے کہ یہ درد مرد ہی کی امانت ہے...... کیسی کیسی قربانیوں کے بعد وہ ایک مرد کو اپنا بناتی ہے..... کیا اس لئے کہ اس کے نیاز مندانہ ناز کو ٹھکرا دیا جائے۔ اس کو بال پڑا ہوا مٹکا سمجھ لیا جائے نہ رکھنے کے قابل نہ پھینکنے کے لائق اور بے توجہی کے ساتھ اس کو چھوڑ دیا جائے انگاروں پر لوٹنے کے لئے کانوں

پر تڑپنے کے لئے۔ تم نے ایک مرد ہوتے ہوئے بے رخی برتی مجھے اپنا افسانہ ختم کرنے سے پہلے چھوڑ دیا۔ دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ تمھاری شان مردانہ تھی۔ لیکن میں نے .... ایک عورت نے .... نرم دل، ضعیف عورت نے بھی تم سے بے وفائی کی ..... تم کو حق تھا کہ تم اپنی محبت کے لئے کوئی دوسری جوانی تلاش کرتے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ شانتا مرگئی! ..... نامراد مرا نہیں کرتے۔ کیا واقعی تم کو میرے ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنا.. منظور ہے۔ اپنے چرنوں میں ایک دم دینے والی خواہش ہے تو آؤ اپنی کوٹھی کے قریب لارنس والے بنگلہ میں شانتا سے ملو۔ خدا کی کارسازی سے کیا بعید ہے کہ ہماری دوامی تسکین کا سامان پیدا ہو جائے۔

شانتا"

یہ خط گل وبلبل کے اڈیٹر کو بغرض اشاعت بھیجکر لالہ فام فوراً الہ آباد روانہ ہو گئی اور لارنس والے بنگلہ میں اپنی عارضی رہائش کا انتظام کر لیا۔ یہ بنگلہ ایک بیوہ میم کی ملکیت تھا۔ الہ آباد میں قیام کے زمانہ میں لالہ فام کی اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ بیوہ میم لالہ فام کی پردہ داری اور آفتاب سے علیحدہ کرا کے بنگلہ میں رہنے سے متعجب تو ضرور ہوئی لیکن ہندوستانیوں کی طرح اس کی جستجو کو اپنا فرض نہیں سمجھا۔

گل وبلبل آتا ہے۔ آفتاب اسے کھولنا چاہتا ہے، ہاتھ کانپنے لگتا ہے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ ورق الٹتا ہے "نثر میں شاعری" کے عنوان سے وہ خط نظر آتا ہے جس میں شانتا لکھا ہوا ہے۔ شوق کی خواہش ہے

کہ ایک نظر میں سارا مضمون دل میں اتر جائے لیکن آنکھیں جھپنی جاتی ہیں۔ خیالات میں حشر برپا ہے۔ آخر پڑھنا شروع کرتا ہے۔ ہر لفظ، ہر فقرے اور ہر سطر سے ایک نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ختم کرنے کے بعد اس کے جذبات اس کے کہنے میں نہ تھے۔ دماغ پچھلی محبت کو دوہرا رہا تھا۔ دل اندھا بنا ہوا ایک نئے افسانہ میں گم تھا۔ لالہ فام کی یاد، اس کی محبت کا آغاز، انجام، پیمان.... شکستہ شناشا کی مبہم تصویر، حسن پرستی کا ولولہ، ایک خوش آئند محبت کا ارمان یہ ساری باتیں اس کے خیالات کو یکسو ہونے نہیں دیتی تھیں۔ وہ برآمدہ کے ستون سے لگا ہوا بجس و حرکت خاموش کھڑا ہوا تھا۔

اتنے میں ملازم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ جواب ندارد۔ پھر اس نے ذرا قریب آکر عرض کیا "میاں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس آواز نے آفتاب کو خیالی دنیا سے مادی دنیا میں آنے کے لئے مجبور کیا۔ اس نے متفکر لہجے میں "اچھا" کہا اور جب نوکر جانے لگا تو اسے روکا "دیکھو! لارنس والی کوٹھی جانتے ہو۔ یہ کیا ہے جس میں وہ بڑھیا میم انڈے اور مرغیاں بیچا کرتی ہے وہاں چلے جاؤ۔ دریافت کرنا اس میں کوئی ہندوستانی مرد یا عورت آیا ہوا ہے اچھی طرح پوچھنا۔"

آفتاب ابھی کھانا ہی کھا رہا تھا کہ اس کا فرستادہ لارنس والی کوٹھی سے واپس آگیا "کہو منیر کیا خبر لائے؟"

منیر: - میاں پہلے تو دروازے پر میم ملی۔ اس سے پوچھا۔ چڑیل نے یہ کہکر ٹال دیا۔ ہم نہیں جانتا ہم نے بنگلہ کرایہ پر دیا ہے تم خود معلوم کرلو۔ پھر ایک نوجوان مہری دکھائی دی شاید نوکر ہوگی۔ اس سے بات کرتے ہوئے میرا جی ڈرا۔ آگے بڑھا تو برآمدہ میں خانساماں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اشارہ

سے بلایا۔ کہنے لگا کہ ہماری بیگم صاحبہ نے ابھی تو بنگلہ کرایہ پر لیا ہے مگر وہ اسے مول لیں گی۔ ان کا نام شانتا ہے، بڑی خوبصورت ہیں، یہاں شادی کرنے کو آئی ہیں۔ بس میاں وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اندر سے اس کا بلاوا آگیا اور وہ چل دیا۔

ہاتھ کا نوالہ ویسا ہی آفتاب نے طشتری میں رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور سیدھا لکھنے پڑھنے کے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں منیر پھر لارنس والے بنگلہ میں تھا۔ اور لالہ فام کے نازک اور کانپتے ہوئے ہاتھوں میں گلابی رنگ کا ایک معطر کاغذ تھا جس میں لکھا تھا۔

"ڈیر شانتا! میں اپنے پریشان خواب سے جاگ اٹھا ہوں۔ ارمان بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ اب انتظار کٹھن ہے۔ تم آؤ گی یا میں آؤں؟ کب کس وقت؟ میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی فیصلہ ہو جائے۔ بلکہ ابھی کیا رائے ہے؟"

"پریمی"

لالہ فام مسکرائی "کہہ دو جواب ملتا ہے چند منٹ ٹھہرو"

آفتاب گھبرایا ہوا کپڑے پہن رہا ہے۔ کبھی شیروانی پہنتا ہے کبھی کوٹ۔ ٹائی باندھتا ہے۔ گرہ نہیں لگتی پھینک دیتا ہے۔ ہر بٹن لگاتا ہے۔ پورے نہیں لگتے" اوپر کا بٹن اور نیچے کا کاج خالی رہ جاتا ہے۔ تیل کی جگہ لونڈر سر میں اور لونڈر کی جگہ تیل رومال پر ڈال لیتا ہے۔ شرابیوں کی سی حالت ہے۔ سامنے سنگھار دان پر ایک کاغذ کھلا ہوا رکھا ہے۔ ہر دو منٹ کے بعد اس کو اٹھاتا ہے۔ پڑھتا ہے اور رکھ دیتا ہے۔ کیف مستی میں

ایک ساغر کا اور اضافہ ہو جاتا ہے ۔ یہ کاغذ لالہ فام کی طرف سے تھا :۔

میرے پریمی ! زیادہ عجلت سے ڈر لگتا ہے ۔ تم بھی اس جلد بازی کا خمیازہ بھگت چکے ہو اور میں بھی ۔۔۔۔۔۔ شانتی سے کام لیتے تو اچھا تھا ۔ مگر نہ تم میں صبر پہلے تھا نہ اب ہے ۔۔۔۔۔۔ اچھا آجاؤ یا مقدر یا نصیب "

" شانتا "

لالہ فام پردہ کے اندر اور آفتاب باہر کرسیوں پر بیٹھے ہیں دونوں خاموش دونوں ساکت ۔ دل دھڑکنے سے تھمے جسم کی لرزش جائے ۔ سانس اپنے ٹھکانہ پہ آئے دماغ اپنا کام کرنا شروع کرے تو زبانوں میں حرکت پیدا ہو ۔ جب تصویر بہ تصویر کا عالم مکدر ہونے لگا تو آفتاب نے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا :۔

" کیا پردہ میں رہ کر آپ تبادلۂ خیالات کریں گی ؟

" بے پردگی سے راحت نہیں ملی ۔ نقاب اٹھنے کے بعد کیا چیز باقی رہ جاتی ہے جس کے شوق میں ارمانوں کی پرورش کی جائے ۔

" آپ نے یہ خوب بات کہی شانتا ! میں مانتا ہوں ۔ لیکن موجودہ تمدن میں یہ کچھ پسندیدہ چیز نہیں ہے "

شانتا :۔ نہ ہو ۔ کیا آپ کو ذاتی طور پہ بے پردگی کے متعلق کوئی خوشگوار تجربہ ہے ۔ سچ کہنا پریمی !

پریمی :۔ نہیں ! حقیقت تو یہ ہے کہ ملاقاتوں میں عریانی جذبات میں کوئی تشنگی باقی نہیں رہنے دیتی ۔۔۔۔۔۔ مجھ کو تو ایسا تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ بس دل ہی جانتا ہے ۔

شانتا :۔ پھر بھی آپ مجھ کو قبل از وقت بے پردہ دیکھنا چاہتے ہیں ۔ تلخ کے بعد تلخ تر تجربے کی خواہش ہے ۔

یہ کہہ کر پردہ میں سے ہاتھ بڑھا کر لالہ فام پانوں کی تھالی پیش کرتی ہے آفتاب شانتا کو پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس کا ہاتھ بھی نظر آیا ۔ وہ سوچنے لگا کہ آواز بھی سنی ہوئی ہاتھ بھی دیکھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن کہاں یاد نہیں ۔

شانتا :۔ کیا سوچ رہے ہو ۔ کیا پردہ میں رخنہ ڈالنے کی فکر ہے ؟

پدمنی :۔ سوچ کیا رہا ہوں تمہاری نسبت طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں ۔

شانتا :۔ ڈرئیے نہیں میں خوب صورت ہوں، جوان ہوں ۔

پدمنی :۔ یہ بات نہیں بلکہ مجھے کچھ شبہ سا ہو رہا ہے ۔

شانتا :۔ " یعنی میں لالہ فام ہوں " آفتاب پردہ کی طرف متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگا ۔ گویا وہ پردہ اٹھا کر اندر گھس جائے گا ۔

پدمنی :۔ آپ لالہ فام کو جانتی ہیں ؟

شانتا :۔ خوب اچھی طرح ۔ وہ میری سہیلی ہیں ۔

پدمنی :۔ اور ان کے حالات سے بھی واقف ہیں ؟

شانتا :۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے حالات سے ۔ آفتاب کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے ۔

پدمنی :۔ سارے حالات سے ؟

شانتا :۔ ایک ایک دن کے ۔ ایک ایک گھنٹہ ایک ایک منٹ کے ۔ اچھے برے ۔

پدمنی :۔ وہ آج کل کہاں ہیں ؟

شانتا :۔ کیوں خیریت! پھر ادھر دل بھر بھر آیا ؟

اس فقرے سے آفتاب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

شانتا :۔ کہیں خدانخواستہ آپ آفتاب تو نہیں ہیں ورنہ لالہ فام سے آپ کو کیا دلچسپی ؟

اب تو آفتاب بالکل ہی سٹ پٹا گیا۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔ ہمت نہیں پڑ تی تھی کہ شانتا کے سامنے بیٹھا رہے لیکن بھاگا بھی نہیں جاتا تھا۔

شانتا :۔ بولئے کھو کیوں گئے ؟ افسانہ کے کاغذی باغ میں تو خوب چہکنا آتا ہے۔ یہاں بھی تو کوئی بولی بولو ...... کیا آپ آفتاب ہیں ؟

پدمنی :۔ ہوں تو آفتاب! لیکن آپ کو اس سے کیا ؟

شانتا :۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ لالہ فام سے اب آپ کو کوئی تعلق نہیں ہے ؟

آفتاب :۔ ہے ! تمہاری محبت کے سرگم نے لالہ فام کو بسنت رت کی طرح ایک دفعہ پھر میرے سامنے لا کھڑا کیا۔

شانتا :۔ پھر تم نے لالہ فام کی جستجو کی! اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کا سامان کیا ؟

آفتاب :۔ نہیں! افسوس نہیں۔

شانتا :۔ اس کا سبب ؟

آفتاب :۔ پہلے ان کی بیوفائی پر غصہ رہا۔ وہ ٹھنڈا ہوا تو اپنی بے اعتنائی پر شرمندگی رہی۔ یہ کم ہو چلی تو تم نے میرے تصورات کو جذب کرنا شروع کر دیا۔

شانتا :۔ اب کیا ارادہ ہے ؟ یہ سوال آفتاب کے لئے نہایت اہم تھا۔

آفتاب:۔ لالہ فام آج کل کہاں ہیں؟ اس کا آپ نے جواب نہیں دیا۔
شانتا:۔ آپ اپنا مطلب فرمائیے؟
آفتاب:۔ کیا وہ مجھ کو معاف کر دیں گی؟ میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں۔
شانتا:۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لالہ فام نے اپنے گھر پہنچتے ہی تم کو معاف کر دیا تھا۔ وہ بھی اپنی فطری کمزوریوں سے شرمندہ ہیں۔ اگر آپ ملاپ کے لئے تیار ہیں تو اس خدمت کو میں انجام دے سکتی ہوں ۔۔۔ لیکن میری محبت کا کیا حشر ہوگا؟
آفتاب:۔ آپ اسی طرح میرے دل کی مالک رہیں گی۔
شانتا:۔ واللہ ایک میان میں دو چھریاں! معلوم ہوا کہ آپ کی انھی باتوں نے لالہ فام کی محبت کو مجروح کیا ہے۔
آفتاب:۔ آپ میرا مطلب غلط سمجھیں۔ لالہ فام کی اور آپ کی محبت میں فرق ہوگا۔
شانتا:۔ یعنی؟
آفتاب:۔ اگر لالہ فام نے بخوشی میرا شریک رہنا پسند کر لیا تو وہ ہمیشہ کے لئے میری محبوب ترین بیوی اور آپ میری خواہر ۔۔۔۔۔
آفتاب اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بجلی کی سرعت کے ساتھ کسی نے پردے میں سے نکل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آفتاب کی زبان سے لالہ فام نکلا۔ لالہ فام نے ہاں آفتاب کہا اور دونوں ہم آغوش ہوگئے ع

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

شانتا اب حقیقی معنوں میں دیوی بن گئی ہے اور پریتی نادر ہند کا

سپوت بیٹا۔ نہ جذبات کو بھڑکانے والے افسانے ہیں۔ نہ روح کو مدہوش کرنے والے رومان۔ ایک سادہ، بے تکلف منزلی زندگی ہے کہ گذر رہی ہے۔

اشرف صبوحی دہلوی

چکر

ننھیاں :- "موجودہ زمانہ کا اڈیٹر وہی حیثیت رکھتا ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت روما کے بشپ اور پوپ کی تھی۔ ہم بھی اس فرض کے ماتحت رسالہ کی بارگاہ میں اپنی حماقتوں کا تذکرہ اور اپنے گناہوں کا (کنفشن) اعتراف کر کے گناہوں کے بار کو ہلکا نہیں کرتے لیکن تنہائی کے عذاب سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں فرق یہی ہے کہ اڈیٹر شائع کر دیتا ہے اور پوپ مخفی۔"

ابو طاہر

ہندوستان میں لڑکے کے لئے شادی کا معیار یونیورسٹی ہے اور لڑکی کے لئے اس کے والدین۔ اس کے علاوہ طرفین کی ذاتی خصوصیات خارج از بحث

ہیں۔ بالخصوص لڑکی کے متعلق جس قدر معلومات بہم پہنچتی ہیں وہ اسی نوعیت کی ہوتی ہیں جیسی کہ سرکاری سنسر شدہ خبریں جن میں مصلحت وقت کے لحاظ سے رنگ آمیزی ایک لابدی عنصر ہے۔ مثلاً مضمون نگار اور ادیب لڑکیاں وہ کہی جا سکتی ہیں جو اپنے بھائی کے لکھے ہوئے مضامین کی صحیح نقل کر سکیں۔ امور خانہ داری میں ماہر وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو کئی مرتبہ گڑیا کے بیاہ کا انتظام خود بہ نفس نفیس کر چکی ہوں۔ حسن اور خوب صورتی ایک اضافی شے ہے، یعنی میری جدا پسند ہے آپ کی ہے جدا پسند اور اس لحاظ سے حوا کی سو فیصدی اولادوں کو فطرت کی ان آسانیوں کے زیر اثر خوبصورت ہونے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ ان کے حواس خمسہ صحیح حالت میں ہوں اور قانونی زبان میں صحت عقل اور درستیٔ ہوش و حواس پر رائے زنی نہ کی جا سکے۔ اب رہا عمر کا تعین سو اس کا معیار فی زمانہ بال، دانت اور کھال نہیں کہے جا سکتے۔ کیونکہ قدرت اس چودھویں صدی میں اپنے دستور العمل میں بہت سرعت کے ساتھ ترمیمیں کر رہی ہے۔ بجلی کی روانی آپ میٹر میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن عمر کی روانی آپ چہرے میں نہیں دیکھ سکتے۔ مقیاس الحرارت بنا لینا آسان ہے لیکن مقیاس العمر بنانا مشکل اس لئے ثبوت کی عدم موجودگی میں آپ گواہوں کے بیان پر یقین کرنے پر مجبور کئے جائیں گے۔ اسی سلسلہ میں ریاضی کے مسلم الثبوت اصول بھی تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی کرۂ ارض کے سورج کے گرد ایک گردش بعض اوقات ن × ۳۶۵ دن لے سکتی ہے جس میں ن ایک غیر متعین عدد ہے جس کا صحیح یقین امی جان کے فارمولے پر منحصر ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اگر ایک لڑکی نے سنہ ۳۰ء میں پندرھویں سال میں قدم رکھا تھا تو

۱۹۷۳ء میں وہ پندرہ ہی سال کی رہے گی۔ اس ضمن میں چند خاص اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم زبانی ٹکسال میں جدا ہے اور لڑکی کے لین دین میں جدا۔ مثلاً لاغر، نازک تن صاحب فراش، دھان پان۔ الغرب۔ گداز۔ مدقوق متفکر سدامریض۔ اختلاج قلب کی بیمار۔ سیاہ رنگ۔ پختہ رنگ۔ نادان، شرمیلی۔ زرد رو۔ کندنی۔ سپید بال۔ نزلہ۔ کاھل۔ اولوالعزم۔ نینی تال۔ میکہ۔ کالی کھانسی۔ نند۔ پلنگ۔ سسرال مہمان۔ اینڈھن۔ جہیز۔ رونمائی۔ روپیہ سود پر چلانا۔

ذات کی تحقیق و تدقیق بیکار شے ہے، کیونکہ ہر دس سال کے بعد مسلمانوں کے مختلف فرقے سیّد ہونے کی باقاعدہ رجسٹری کرا لیتے ہیں اور نجیب الطرفین ہونے کا کاپی رائٹ، اگر یہ رفتار اسی طرح جاری رہی تو ہم کو ڈر ہے کہ مبادا پٹھان اور شیخ ڈھونڈے سے بھی دستیاب نہ ہوں گے۔

اندریں حالات وہ نوجوان جو شادی کرنے کا نوٹس دے چکے ہیں۔ بیحد ممنون ہوں گے، اگر کوئی تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون سراغرسانی کا ایک خفیہ محکمہ کھول کر ان کی صحیح رہنمائی کریں گی اور شادیوں کے تھوک فروش ایجنٹ صاحبان سے گلو خلاصی۔ بعض تعلیم یافتہ حضرات کا خیال ہے کہ فوٹو کا تبادلہ کم از کم صورت کے مسئلہ کو حل کر دے گا۔ لیکن ان کو علم نہیں کہ کیمرہ حسن و قبیح دونوں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہے کسی کمشنر کا ہنگامی طور سے معائنہ کے لئے جانا بھی بے سود ہے کیونکہ لڑکیاں بذات خود کیمرے کی پلیٹ ہیں۔ ان کا رنگ انسانی شعاعوں سے اڑ جاتا ہے اور اس کا رنگ سورج کی شعاعوں سے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ راویوں کے بیان پر یقین لے آنا تفرقے کا موجب ہوتا ہے

اسلامی تاریخ آپ کی شہادت میں موجود ہے۔ آخری صورت یہی ہے کہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا جائے۔ لیکن وہ باعزت طریقہ سے ناممکن ہے تاآنکہ اخلاقی گناہ کا مرتکب ہو کر اس کوچہ مخصوص سے ایک مصنوعی برات نہ نکالی جائے یا ایک نمائشی ہنگامہ برپا نہ کیا جائے۔ میرے ایک دوست نے اس سوال کو اس طرح حل کیا تھا کہ اپنی منسوبہ کے والدین کو خود انہی کے ایک قریبی عزیز کی یکبارگی بیماری کا تار دیا تھا اور اس کے بعد اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کئی روز تک مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن ان کی پشیمانی سے ہم کو بجد ہمدردی ہوئی جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ تعجیل کو مدنظر رکھتے ہوئے سڑک کے راستہ سے موٹر پر روانہ ہو گئے تھے۔

گو یہ دقتیں ایک مخصوص وقت پر تمام نوجوان کو اول بار اور بوڑھوں کو آخر بار پیش آتی ہیں لیکن خصوصیت سے ہماری بی، اے پاس والی برادری کو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔ کیونکہ دماغ میں "آئیڈیل وائف" کی خیالی تصویر ہوتی ہے۔ زیر نظر "آئیڈیل میرج" پر فصیح و بلیغ خطبے اور دل کی گہرائیوں میں "آئیڈیل ہوم" کی بنیادیں۔ اس اصول پر کہ امیدیں بہت کم بر آتی ہیں۔ ہم اپنے لطیف نازک اور حسین تخیل کو اس خوفناک حقیقت سے چکنا چور کرنے پر ذرا مشکل سے آمادہ ہوتے ہیں۔ کاش کہ "بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کئے ہوئے"۔ لیکن افسوس ہے اور مجبوری کہ اللہ میاں کی نظروں میں ہمارے پاس ایمان ہیں اور ابنائے وطن کا ہم پر اطمینان ہے۔ وہاں نمازیں معرض تخفیف میں آجاتی ہیں اور یہاں ذفار ـــــ دیگرنہ ہے شرط کہ ہم سب متحد ہو کر ایک پارٹی بنالیں اور سنیہ گرہ کرلیں یہاں تک کہ ہمارے تمام مطالبات منظور کر لئے جائیں۔

ستم ہے کہ مجرد آدمی نظروں میں کھٹکتا ہے جیسے پولیس کے لئے انقلابی
پارٹی کا ایک رکن، جاسوس اس کے پیچھے اور وارنٹ اس کے سامنے۔ جس طرح
قیدی کا تمام بار مہمانی سرکار اٹھاتی ہے اسی طرح داماد کا سسرال۔ اس سے بحث
نہیں کہ اول الذکر کو تمام عمر چکی پیسنا پڑے اور آخر الذکر کو دانت۔ یہی نہیں بلکہ
ایک طرح سے مجرم کو مجرد پر فوقیت ہے۔ وہاں سزا جرم کے بعد ہوتی ہے اور
یہاں جرم سے پہلے۔ یعنی محض امکان جرم پر۔ ان خدائی فوجداروں سے
بزعم خود جو شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانے کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ محض
پیچھا چھڑانے کے لئے آپ کہہ دیجئے کہ "ملازمت نہیں ملتی" وہ فوراً بول اٹھینگے
"شادی بعد کہئے" سردست روپیہ نہیں ہے۔ اطمینان سے کہئے کہ "شادی بعد"
کہئے والدین راضی نہیں ہوتے۔ اس کا بھی خاموشی سے جواب دیں گے "شادی
بعد" اور اگر برافروختہ ہوکر کہہ دیجئے کہ لڑکی اچھی نہیں ہے ——— ستم ظریفی
تو ملاحظہ فرمائیے بیساختہ وہی طبلے کا سارٹا ہوا فقرہ دہرا دیتے ہیں یعنی شادی بعد

ہم بھی مضمون ہو رہے تھے۔ ایسے ہی عنوان کے۔ سات آٹھ نمبروں میں
سے کسی ایک پر نمبر لگانا عرف عام میں سٹہ یا لاٹری کہا جاتا ہے اور حقیقت میں
قسمت آزمائی۔ سرخیٔ افسانۂ دل کچھ اور تھی واقعات کچھ اور ——— اس لئے ہمنے
احتیاطاً مختلف مقامات پر اپنی خبر رساں ایجنسیاں قائم کیں اور معزز اخبار
اخباروں کے پنشن یافتہ رپورٹروں کا تقرر۔ لیکن ہماری مایوسی کی کوئی انتہا
نہ رہی جب ہم نے یہ دیکھا کہ من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید۔ ریل گاڑی
کی دونوں متوازی پٹریوں کی طرح جو کبھی ایک دوسرے سے ملتی ہی نہیں۔
دو رپورٹروں کے بیانات بھی ہمیشہ مختلف ہی رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ
اخبار دلچسپ ہوتے ہیں اور پبلک خشک۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ قرعہ

اندازی کر کے اس امر کا تصفیہ کر لیں لیکن عین اسی وقت ایک ضعیفہ زیر غور امید واروں میں سے ایک کی پیغامبر بن کر ہمارے پاس آئی۔ اس نے لڑکی کو حسن میں نور جہاں۔ بہادری میں چاند بی بی، اخلاق میں نائٹ انگیل اور تقریر میں سروجنی کے ہم پلہ بنا دیا۔ یقیناً ہم اس قدر کہنے کے لئے تیار ہیں کہ خود اس کی فصاحت و بلاغت سے اس طرح شکست کھا گئے کہ ہم نے متذکرہ مسئلہ پر مزید غور کرنے کے لئے ایک ہفتہ کی مہلت طلب کی۔ لیکن وہ تین ہی دن کے بعد ہم پر ایک بار واڑی مہاجن کی طرح آ کر سوار ہو گئی اور قطعی فیصلہ کرنے کا الٹی میٹم دینے لگی۔ وہ بھی مجبور تھی کیونکہ دن بدن مقابلہ سخت ہو رہا تھا اور امید واروں کی فہرست میں اضافہ۔ خود ہماری خوش قسمتی تھی کہ والدین ہمارے حق اولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری جانب داری کرنے کے لئے تیار تھے۔ بشرطیکہ ہم اسی وقت اقرار کر لیں جو ہمارے لئے قریب قریب ناممکن تھا۔ اس لئے ہم نے اپنی مجبوریاں ظاہر کر کے تکلیف دہی کی معافی چاہی، جو بخوشی منظور کر لی گئی۔ لیکن ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس کے دوسرے ہی روز وہاں کے ایک ذمہ دار رکن تشریف لائے اور ہم کو متقل قریب کا ایک مسلم الثبوت داماد خیال فرما کر تاریخ نکاح کے اہم مسئلہ پر گفت و شنید کرنے لگے۔ اس دلچسپ مغالطہ سے ہم کچھ دیر تک تو لطف اٹھاتے رہے لیکن جب یہ حقیقت تلخی کی حد تک پہنچ گئی تو ہم نے ان کے اس طرز عمل کی وجہ دریافت کرنے کی زحمت گوارا کی۔ جس کے جواب میں انھوں نے "ہائیں" کہہ کر تعجب کی اداکاری کو اس طرح مکمل کیا کہ ہم کو تشویش پیدا ہو گئی۔ فرمانے لگے کہ "آپ نے ضعیفہ سے زبانی اقرار کر لیا ہے اس کو جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟" میں نے دریافت کیا۔
"بہت ممکن ہے" انھوں نے اس طرح کہا کہ جیسے کشتی لڑنے کا وقت آچکا ہے اور اس کے بعد وہ دامن جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک ہفتہ کے بعد مجھ کو ایک خط ملا۔ جس میں مجھ کو "عزیز از جان" کے خطاب سے یاد کیا گیا تھا اور نفس مضمون میں وہی مطالبہ تھا جس کی تمہید زبانی کی جا چکی تھی میں خاموش رہا۔ دوسرے ہفتے ایک دوسرا خط موصول ہوا۔ جس میں میرے مفروضہ جواب کا حوالہ دیتے ہوئے میری "سزائے موت" کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی اور اسی میں میری طرف سے بھیجی ہوئی رسمی مٹھائی کی رسید بھی ملفوف تھی اس خط کے دو ہی دن بعد ہم کو ایک پارسل موصول ہوا۔ جس میں ہماری شادی خانہ آبادی کے منظوم کارڈ رکھے ہوئے تھے جن کے کنارے مطلّا اور عبارت مسجع اور مقفہ۔ ملفوفہ خط میں ہم کو اطلاع دی گئی تھی کہ شہر کے عمائدین اور حکام کو کارڈ تقسیم کر دئے گئے ہیں۔ بالآخر ہمارا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا اور ہم نے ان کے کارڈ واپس کرتے ہوئے ان کو دھمکی دی کہ اگر ان کا یہی طرز عمل رہا تو ہم یہ معاملہ پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے جواب میں ہم کو ایک حیرت انگیز تحریر موصول ہوئی جس میں لکھا تھا کہ "آپ کی مجبوری کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نکاح فی الحال ملتوی کئے دیتے ہیں" گویا یہ شاخسانہ تھا کسی آئندہ اسکیم کا۔ بہرحال ہم نے ایک اطمینانی سانس لی اور بطور احتجاج شادی کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔



کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے ——— یہی تعریف ہے ہر رومان کی اور رومانی نقطۂ نظر سے حضرت موسیٰ مذہبی لٹریچر میں بڑی اہم شخصیت رکھتے

ہیں۔ جو دلچسپی اور مسرت غیر متوقع اور خلاف امید واقعات کے پیش آنے سے ہوتی ہے وہ مدت العمر فراموش نہیں کی جا سکتی۔ رومانی تشنگی فطرت کے ماتحت ہے اس کی سیرابی قسمت کے ماتحت۔ یقیناً وہ لوگ قابل صد ہزار افسوس ہیں کہ جن کی زندگی کے تمام لمحے رومانی ضیا پاشیوں سے محروم رہے۔ اور ایسے ہی لوگوں میں ہمارا بھی شمار تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے کہ ہمارے ذرات میں انقلاب روح کی گہرائیوں میں ارتعاش اور دل میں اضطراب ہو رہا ہے جس طرح پانی برسنے سے قبل ایک قسم کی امس ہوتی ہے، اسی طرح ہمارے جذبات میں بھی برانگیختی تھی۔ کیونکہ ہماری فطرت رومان کی متلاشی تھی —— اور حسن اتفاق تھا کہ رومان اس پر پھٹ پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنے وطن سے نو سو میل کے فاصلہ پر تعلیمی سلسلہ میں بمبئی میں مقیم تھے، جہاں ہم سابق کے ناخوش گوار واقعہ کو فراموش کر گئے تھے اور ایک ایسے مقام پر سلسلہ جنبانی کر رہے تھے، جہاں ہمارے تمام نقطہائے نظر کے مرکز کا امکان تھا۔ یقین تھا کہ مزید سعی و کوشش سے ہم کامیاب ہو جاتے لیکن ہم کو ایک حادثہ پیش آیا جس نے اس گفت و شنید کے مسئلہ کو یک قلم ختم کر دیا۔ وہ حادثہ ایک خط تھا جس پر ایک مقامی ڈاک خانہ کی مہر تھی۔ لفافہ حسین تھا۔ ملفوفہ کاغذ معطر۔ تحریر میں نسوانی جھلک اور مضمون میں نزاکت۔ خط میں ہمارے مضامین کی جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے ہیں تعریف کی گئی تھی اور خود کے لکھے ہوئے ایک مضمون کو صحیح کرنے کی فرمائش جس کی ہم نے اولین فرصت میں تعمیل حکم کر دی۔ دوسرا خط ذرا بے تکلف لہجہ میں موصول ہوا۔ جس میں خود پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ہم اپنی خوش بختی پہ نازاں تھے کہ کالج کی ایک حسین اور آزاد خیال دوشیزہ سے خط

وکتابت کا فخر حاصل کر رہے تھے۔ تیسرے خط میں فرمائش کی گئی تھی کہ میں... آئیڈیل بیوی" پر ایک مضمون تحریر کروں جس کے جواب میں میں نے اپنے تاثرات لکھتے ہوئے ان کے خیالات کو "آئیڈیل شوہر" کے مضمون پر مدعو کیا ایک ماہ کے بعد مجھ کو ایک رسالہ موصول ہوا۔ جس میں انھوں نے اسی عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ مضمون کیا تھا ہمارے عادات و اطوار کا ایک چربہ تھا اور ہماری سیرت کا ایک عکس جس کو نہایت ہوشیاری سے ہمارے ایک سابقہ مضمون" ہم" سے اخذ کیا تھا۔ اس نے ہمارے حسیات میں ایک طلاطم برپا کر دیا اور ہماری جولانی طبع کو مہمیز۔ بعد کے خطوط عشق و محبت کے غیر فانی شاہکار اور ان کے تاثرات چڑھتے ہوئے سمندر کا سیلاب تھے جس کی رَو کے ساتھ ہم بہہ رہے تھے کسی نامعلوم جگہ۔ لیکن ایک خلش ناگزیر تھی اور وہ یہ کہ ان کو پتہ مخفی رکھنے پر اصرار تھا، ملاقات سے انکار تھا اور تصویر بھیجنے سے احتراز۔ کیونکہ ان کو ابھی اطمینان نہیں ہوا تھا کہ ہمارے جذبات اس حد تک پاک ہو چکے ہیں کہ ہمارے تعلقات کے دوسرے دَور کی تمہید کی جا سکے اور یقیناً یہی آئیڈیل کورٹ شپ تھی۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے ایک تخیلی مجسمہ تھا جس کے جلووں کی ضیا پاشیاں ہم کو ہر طرف نظر آتی تھیں۔ ہم کو کھڑکی کے جھروکوں میں سے وہی جھانکتی نظر آتی تھی۔ پارکوں میں ٹہلتی نظر آتی تھی اور پردۂ سینما پر وہی حرکت کرتی معلوم ہوتی تھی ——— مگر آہ یہ سلسلہ ایک سنہری خواب تھا جو آنکھ کھلتے ہی غائب ہو چکا تھا ——— اے عورت تیرا نام کمزوری نہیں ہے بلکہ اے مرد تیرا نام کمزوری ہے۔ میں اس آخری خط کو آپ کے تفنن طبع کے لیئے ذیل میں نقل کیئے دیتا ہوں۔

"...... مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن چونکہ میرا تجربہ مکمل ہو چکا ہے۔ اس لئے اس مغالطہ کو دور کر دینا اپنا فرض اولین خیال کرتی ہوں دراصل واقعہ یہ ہے کہ میں نے ادب اردو میں ایسے عشقیہ خطوط کی کمی کو محسوس کیا جن میں سچی اور پاک جذبات کی جیتی جاگتی تصویریں ہوں۔ ایسے مجموعے کو فراہم کرنے کے لئے میرے کامیاب ذہن میں ایک ترکیب آئی جس پر میں نے عمل کیا اور آپ کو مسرت سے اطلاع دیتی ہوں کہ کامیابی بھی ہوگئی۔ میں نے مختلف ناموں اور پتوں سے اردو کے تیس ادیبوں اور شاعروں کے نام اسی قسم کے خطوط روانہ کئے تھے۔ ان میں سے پچیس کے جواب مجھ کو موصول ہوئے۔ بقیہ پانچ میں دو معذور تھے، اس لئے کہ ضعیف ہو چکے تھے اور تین شاید اس سے قبل کسی کامیاب تجربہ کے تختۂ مشق بنائے جا چکے تھے، اس لئے خاموش رہے۔ آٹھ مہینے کے عرصہ میں میرے پاس ادب اردو کے شاہکار جمع ہو گئے ہیں جن کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے انتظامات کر لئے گئے ہیں، عنقریب ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھی بذریعہ وی۔ پی ارسال ہوگی جس کو وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ اطمینان رکھئے، نام سب کے محفوظ ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کبھی کبھی اپنی خیریت مزاج سے اطلاع دیتے رہئے گا۔"

والسلام

ہم نے اس کے جواب میں ان کو مبارک باد کے ساتھ اطلاع دی کہ شکر ہے خدا کا ہم آپ کے پہلے تجربہ کی تکمیل میں کچھ مدد پہنچا سکے۔ اگر کسی تجربہ کی ضرورت لاحق ہو تو ہم اپنی خدمات کے ساتھ بخوشی تیار ہیں۔



امتحان ختم ہو چکا تھا اور اسی کے ساتھ بمبئی کی لطافتیں بھی —— اس لئے ہم وطن واپس آگئے لیکن شکستہ اور ناکام —— آپ جانتے ہیں کہ سمندر کے انجرات بادل کی شکل میں اٹھتے ہیں اور گھٹاؤں کی شکل میں چھا جاتے ہیں یہاں تک کہ پہاڑ کے آغوش میں پہنچ کر برس پڑتے ہیں۔ بعینہ یہی حال جذبات کا بھی ہے —— میرے دل میں گرج تھی، چمک تھی اور بھڑک تھی۔ محبت کی ایک چٹان خشک ہو چکی تھی۔ اس لئے روح بے چین تھی کسی دوسری ٹکر کے لئے —— اب اس دوسری ٹکر کے واقعات بھی سنئے۔

شہر کے مرکزی مقام پر جانے کے لئے ہم کو ایک نامعلوم کوچہ سے گذرنا پڑتا تھا۔ ایک روز ہم اس طرح جا رہے تھے کہ آنکھیں زمین پر تھیں اور خیالات دماغ میں۔ کہ یکایک ہم کو محسوس ہوا کہ ہمارے سر پر ایک ہلکا سا پلندہ گرا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا —— آپ خود جانتے ہیں کہ ہندوستان میں پردے کے روایتی اصول کی بنا پر "عشق بیک نظر" ایک اٹل اصول ہے اور ایک ہندوستانی ہونے کے لحاظ سے ہم کس طرح مستثنیٰ ہو سکتے تھے۔ واقعی وہ صورت ملائک فریب تھی کہ ہم اس جگہ یکبارگی ٹھٹک گئے۔ حسن کو جانچنے کے لئے سائنس کے آلات کی ضرورت نہیں بلکہ احساسات ہی بیک گردشِ چشم اس کی

موجودگی سے باخبر ہو جاتے ہیں چنانچہ باہم یک دگر نظریں مل گئیں اور ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد ہم سڑک پر اکیلے کھڑے تھے اور اس بالاخانہ پر کوئی نہ تھا۔ چونکہ اِکا دُکا آدمی اُدھر سے آجا رہا تھا۔ اس لئے ہم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کاغذ کے پلندے کو جو ردی کے چند ٹکڑوں پر مشتمل تھا مال غنیمت سمجھتے ہوئے اٹھا کر چل دیئے —— ان میں کوئی خاص بات تو نہ تھی جن سے ہم کو کسی قسم کی مدد ملتی۔ وہ سب کے سب کسی رسالہ کے پھٹے ہوئے اوراق تھے، جن میں قیاس سے حکم لگایا جا سکتا ہے کہ بنئے کے یہاں سے کوئی چیز باندھ کر لائی گئی ہوگی البتہ ایک امر تھا کہ جس کو میں اتفاق ہی سے تعبیر کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ ان میں میرے ایک مضمون کا پھٹا ہوا ورق بھی شامل تھا —— فال نیک تھی اس لئے میں نے کئی روز وہاں کے چکر لگائے۔ لیکن سوائے اس کے کہ چلمن کے پیچھے کسی شے کی موجودگی کا احساس ہوا اور کچھ نہیں۔ البتہ میں وہاں پہنچکر کالی کھانسی کا بیمار ہو جاتا تھا۔ کبھی میرا رومال گر جاتا تھا اور کبھی چھڑی۔ بعض اوقات میں مقابل کی سیڑھیوں پر اپنے جوتوں کے تسموں کو باندھنے لگتا تھا، جو اتنے فاصلے کی مسافت میں اکثر ڈھیلے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک روز میں بدستور ہاتھوں سے تسمے باندھ رہا تھا کہ یکایک چک کو حرکت ہوئی، اور میرے دل کو دھڑکن۔ لیکن میری آنکھوں کے پیچھے اندھیرا آگیا۔ جب میں نے دیکھا کہ جس طرح شیر اپنی کچھار سے نکلتا ہے اسی طرح ایک بوڑھی عورت چک اٹھا کر سامنے کھڑی ہو گئی اور مجھ کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ یکایک میرا رنگ اڑ گیا اور میں نے ارادہ کیا ہی تھا کہ اپنے وجود نامسعود کو اس خطرناک سرزمین سے تیزی اور سرعت کے ساتھ کسی گوشۂ عافیت کی طرف منتقل کر دوں۔ لیکن اس

کے بیساختہ قہقہوں نے میرے قدموں کو زمین سے اس طرح چسپاں کر دیا جیسے گوند والے کاغذ پر مکھی۔ اس کے بعد میری بدحواسی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ جب میں نے سنا کہ وہ میرا وہ نام لے کر پکار رہی ہے جو گھر کی چہار دیواری ہی تک محدود تھا۔ ہم سر پر پیر رکھ کر بھاگنے والے ہی تھے کہ وہ چند ہی منٹ میں ہمارے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جب ہم نے اس کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے یہاں کی سابقہ ملازمہ تھی۔ چونکہ وہ ہم سے بہت بے تکلف تھی اس لئے ہم نے اس کو تمام کیفیت سے آگاہ کر دیا۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ "وہاں کوئی لڑکی ہی نہیں تھی"۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ سوچ کر کہنے لگیں کہ "ہاں دو روز قبل تک تھیں" ——— میرا دل دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر کہنے لگی "وہی جو سرخ دوپٹہ اوڑھے تھیں' نازک سی" ——— میں خوشی سے پھولنے لگا۔

"میاں وہ بڑی غصہ ور ہیں۔ وہاں دال نہ گلے گی"۔ میں مایوس ہونے لگا۔

"ان کے باپ بڑے غیرت دار ہیں ایک آدمی کو گولی مار دی تھی اسی جگہ" میں تھر تھر کانپنے لگا۔

"ہاہ! بہو بیٹیوں کو تکنا بری بات ہے"۔ میں شرم سے پسینے پسینے ہونے لگا۔

اب ہم نے لیکچر دینا شروع کیا۔

"کوئی ہماری نیت خراب ہے"

"ہم شادی کرنا چاہتے ہیں"

"خود سے دیکھ کر کرنے میں کونسی برائی ہو گی"

"انھوں نے بھی ہم کو دیکھ لیا ہے۔"

"تم ہماری مدد کرو ——— ثواب ہوگا۔

اس نے ہم سے ایک خط مانگا۔ ہم نے دیدیا۔ ایک ہفتہ کے بعد اس نے ہم کو سر شام ہی سے بلایا۔ مکان کی پشت کے دروازے سے تاکہ ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ بھال لیں۔ تاکہ بعد کو جب شادی ہوجائے تو شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ اس لئے ہم وقت معینہ پر پہنچے اسی جگہ ——— گھبرائے ہوئے تھرتھراتے ہوئے اور خدائے رحیم و کریم سے دعا مانگتے ہوئے دروازہ پر ماما ہم کو ملی۔ اس نے بہت کچھ اطمینان دلایا۔ اندر داخل ہوئے اندھیرا تھا۔ اس کے بعد ماما کی حسب ہدایت ٹٹولتے ٹٹولتے زینے کیطرف بڑھے۔ مگر بدقسمتی سے ہماری راہبر کو کسی نے اندر سے آواز دی جس کو سنکر وہ بھاگی اور ہم پلٹے۔ مگر عالم اضطراب میں برتنوں کی ایک الماری سے ٹکر کھا گئے جس کی وجہ سے تمام برتن جو کہ اسی دھات کے بنے ہوئے تھے جس کی گھنٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ جھن جھناتے ہوئے نیچے آرہے اور ہم پکڑ لئے گئے فوراً۔ روشنی میں ہم نے ایک بزرگ کو دیکھا اور ایک دوسرے گرانڈیل نوجوان کو۔

دونوں آپس میں کہہ رہے تھے کہ پھانسی دیدو۔

ہم نے آنکھیں بند کرلیں تاکہ اس خواب کو نہ دیکھ سکیں۔

جوان نے ڈانٹ کر ہم کو جگایا۔ دھمکیاں دیں اور زبردستی ہماری جیب میں سے وہ پرچہ نکال لیا۔

بزرگ نے اس کو پڑھ کر حکم دیا کہ لڑکی کو بھی بلاکر پھانسی دینا چاہیئے۔

اب ہم نے خوشامد کرنا شروع کی۔

ان دونوں کم بختوں کا نکاح کر دو۔ جوان نے مشورہ دیا۔
ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ضرور ———
بزرگ نے سر ہلا دیا۔
اب ہم کو نہلایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد نکاح کے کپڑے پہنائے جا رہے تھے۔ اس کے بعد قاضی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم کو باہر کے مکان میں لے جایا جا رہا تھا ——— آہ! یہ خواب تھا یا حقیقت۔ کیونکہ جس وقت ہم نے باہر قدم رکھا ہے تو مکان کو مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا پایا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اتنی سرعت سے اس قدر مہمانوں کا بندوبست کس طرح کیا گیا۔ جب حواس ٹھکانے ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ تمام مہمان ہمارے شہر کے عمائدین میں سے ہیں اور ان میں سے بہت سے ہمارے دوست بھی۔
مسند پر بیٹھنے کے بعد ایک دوست جو ہم سے بہت بے تکلف تھے آ کر شکایت کرنے لگے کہ تم نے اپنی شادی کا جھوٹوں بھی تذکرہ نہ کیا اور سب کو کارڈ تقسیم کرائے۔ ہم ہی کو نہیں بلایا اور اس کے ثبوت میں وہ کارڈ نکال کر دکھانے لگے۔ اس کی جھلک دیکھتے ہی ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ کیونکہ یہ تو وہی کارڈ تھے جو بیرنگ لفافہ کی طرح ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ لڑکی کا نام بھی وہی تھا، باپ کا نام بھی وہی تھا، تاریخ البتہ تبدیل کر دی گئی تھی اور جائے قیام بھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
ہماری آنکھ کھلی ہے تو ہماری شادی ہو چکی ہے اور ہم اپنا سر رکھے ہوئے اسی کے زانو پر لیٹے ہوئے تھے جس نے ہمارے سر پر رد کی گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

(۴)

موت اور شادی دونوں پر تلقین صبر کرنا چاہیئے۔ کم از کم ہمارے حادثہ سے آپ کو ضرور ہمدردی ہو گی۔ لیکن چند ماہ کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ ہم واقعی خوش قسمت ہیں۔ ہمارے خسر نے اپنے خلاف تہذیب رویہ کی ہم سے معافی مانگی اور بیوی نے اپنے حسن اخلاق سے ہماری اشک شوئی کر دی۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ ہندوستان میں عام طور سے اور مسلمان میں خصوصیت سے اگر جاہل ہو تو مشکل اور تعلیم یافتہ ہو تو مشکل۔ ہماری منکوحہ میٹرک تھیں اور اپنے والد کی اکلوتی صاحبزادی۔ لیکن خاندان کی فضا جاہل تھی۔ ان حضرات نے اس اصول پر کہ نہ خود کھاؤ نہ دوسرے کو کھانے دو اپنی دشمنی کا ثبوت اس طرح دیا کہ لڑکی کو بدنام کر دیا۔ اور اس کی شادی کو ناممکن۔ ہم اپنے ایک دوست کے ہاں آتے جاتے تھے اور تعلیم کے متعلق اظہار خیالات کر چکے تھے ——— وہیں لڑکی کے والد کی نگہ اتفاق سے ہم پر پڑی ———
اور جو چیز کہ جائز طور سے حاصل نہیں کی جا سکتی تھی عیاری اور زور سے کی گئی ردی کی گولی کا نشانہ اسی لئے لگایا گیا تھا اور ہم کو ایک ہفتہ کے بعد اسی لئے بلایا گیا تھا تاکہ انتظامات کی تکمیل کے لئے وقت مل جائے۔ بہر حال ہر وہ حادثہ جس کا انجام اچھا ہو مبارک خیال کیا جاتا ہے۔



خوب صورت و خوب سیرت بیوی کے ساتھ عیش و مسرت سے گذارنے کا نام جنت ہے اور اس لحاظ سے ہم واقعی قابل مبارکباد تھے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی اور دوسرے سلسلوں کی طرح منقطع ہوتا نظر آیا۔ کیونکہ ایک روز ڈاکیہ نے ایک خط لا کر دیا جو ہماری بیگم کے نام تھا اور بمبئی سے آیا تھا۔ چونکہ مجھ سے کسی بمبئی کے عزیز یا دوست کا ابھی تک ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے

محض مذاقاً دریافت کیا کہ یہ خط کس کا ہے"!

میرے اس سوال پر میری بیگم کچھ گھبرا سی گئی اور فوراً ہی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی کہ" میری سہیلی کا ہے، جن کا عقد بمبئی میں ہوا ہے" اس کے بعد میں نے اس کو پڑھنے کی اجازت طلب کی جس پر اس نے فوراً آنکھیں پھیر کر قطعی انکار کر دیا۔ ادھر میرا اصرار بڑھ رہا تھا اور ادھر اس کا انکار۔ یہاں تک کہ اس رسّہ کشی میں وہ تو اپنی جگہ پر قائم رہی اور میں دوبارہ جاکر بمبئی میں گرا تکمیل تعلیم دوسرا مقصد تھا اور مکان سے دوری پہلا۔

(۶)

زندگی کے مغالطوں اور ستم ظریفیوں سے تنگ آگیا تھا۔ بیگم کے خطوط میرے پاس آتے تھے لیکن میں جب کبھی دل چاہتا تھا رسمی طور سے جواب دیدیا کرتا تھا ——— اس کے علاوہ میرے لئے اور کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ البتہ میں اپنے بکس کے خطوط نکال کر پڑھ لیا کرتا تھا اور اس طرح اپنی مایوسیوں اور ناکامیوں کو پامال کر رہا تھا۔ آخرش جب مجھ میں یارائے ضبط نہ رہا تو میں نے ——— یارسے چھیڑ چلی جائے اسد ——— کے اصول پر اس خاتون کو ایک خط تحریر کر کے اپنے دل کی تمام کیفیات کا اظہار کر دیا۔ تقریباً دس روز کے بعد سلسلۂ مراسلت دوبارہ شروع ہو گیا لیکن اب ایک دوست اور ناصح کی طرح سے۔ اس طرز عمل سے مجھ کو بے حد کوفت ہوئی۔ لیکن چارہ کار ہی کیا تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک مرتبہ ان خطوط کے مجموعے کی اشاعت کے متعلق بھی سوال کیا جس کے جواب میں مجھ کو انتظار کرنے کی فہمائش کی گئی۔

ایک روز مجھ کو اپنی بیگم کی طرف سے ایک لفافہ موصول ہوا، جس کو

میں نے چاک کر کے ملفوفہ خط کو نکالا۔ میں اس بات پر کس قدر متحیر ہوا ہوں کہ اس کی تحریر میری بیگم کے خط سے بالکل مختلف تھی۔ اور ہو بہو میری مراسلہ نگار خاتون سے ملتی جلتی تھی۔ خط کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ دراصل یہ خط بیگم کا لکھا ہوا نہیں تھا بلکہ اسی خاتون کا ہے تو وہ میرے وطن کس طرح پہنچ گئی لیکن مزید غور کرنے سے مجھے اپنی رائے بدلنا پڑی کیونکہ لفافہ کے اوپر میرا پتہ قطعی میری بیگم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا ——

اب مجھ کو اس میں کوئی شک ہی نہ رہا کہ دراصل خاتون اور بیگم دو ہستیاں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور اس عمل نے میری رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں اب زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

محض اس راز کے دریافت کرنے کے لئے میں یکایک اپنی بیگم کے پاس پہنچا اور اس سے اس کی تفصیل کا سخت مطالبہ کیا۔ اس نے میرے خیال کی لفظ بلفظ "تائید کی اور کھلے الفاظ میں اقبال کر لیا کہ دراصل وہی مراسلہ نگار خاتون کا روپ بدلے ہوئے تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ "کیوں اس نے مجھے اس قدر زبردست مغالطہ کا شکار کیا؟"

"تاکہ آپ کے بڑھتے ہوئے جذبات کی رَو کو روکنے کے لئے ایک مضبوط چٹان کا کام دے سکے۔" اس نے مجھے جواب دیا۔

اور واقعی یہ درست بھی تھا۔ اگر خط و کتابت کے سلسلہ کی دلچسپیاں نہ رہتیں تو میں ضرور اپنا کیریکٹر کھو چکا ہوتا اور انسانی ہوس پرستی کا شکار ہو گیا ہوتا۔ گو اس کا یہ فعل مجھ کو خود کے لئے محفوظ رکھنے کی نیت سے تھا لیکن تاہم میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد میں نے اس بمبئی سے آئے ہوئے خط کا راز دریافت کیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ خط دراصل اس کی سہیلی جو بیگم کے خط وصول کر کے دوسرے لفافے میں رکھ کے پوسٹ آفس سے مجھ تک روانہ کر دیتی تھی اور اس طرح وہ مجھ میں اور مراسلہ نگار خاتون یعنی میری بیگم میں ایک واسطہ کا کام انجام دیتی تھی۔ میں نے اس کے بعد اس سے مطالبہ کیا کہ شادی کے بعد ہی اس نے اس خاص راز کو دوسرے امور کے ساتھ کیوں نہ ظاہر کر دیا۔ اس کا اس نے یہ جواب دیا کہ میں دراصل یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کو مراسلہ نگار خاتون سے واقعی عشق ہے یا یہ خطوط محض ادبی سرگرمیاں ہی تھیں ابھی تک کسی راستے پر نہیں پہونچی۔ کیونکہ میری اسکیم ابھی مکمل نہیں ہونے پائی تھی کہ راز طشت از بام ہو گیا اور وہ اس طرح کہ میں نے دو خطوط تحریر کئے تھے۔ اور دونوں مختلف انداز تحریر میں اور اس کی مجھ کو کافی مشق ہے

ایک خط خاتون کی طرف سے اور دوسرا اپنی طرف سے۔ خاتون کا خط میں اپنی سہیلی کو روانہ کرنا چاہتی تھی تاکہ وہاں سے آپ کی طرف بھیج دیا جائے اور اپنا خط براہ راست آپ کو روانہ کرنا چاہتی تھی لیکن مجھ کو خود ایک شدید مغالطہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ آپ کا خط اپنی سہیلی کے لفافے میں رکھ دیا اور خاتون کا خط آپ کے لفافے میں۔

شکر ہے کہ مغالطوں کا یہ لامتناہی سلسلہ ٹوٹ چکا ہے اور اب ہم ازدواجی زندگی کی مسرتوں کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ہم آپ کو رائے دیتے ہیں کہ آپ بھی کہیں منسلک ہو جایئے اور اپنی زندگی کو تنہا بسر کر کے معرض خطر میں نہ ڈالئے۔

سعید ابو طالب۔ بی۔ ایس۔ سی۔ لک

سید وصی اشرف چشتی مالک کتب خانہ علم وادب دہلی نے
علمی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا